اصولِ دعوتِ دین

شعبۂ دعوت و ارشاد

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصول دعوت دین

مصنف

عبدالکریم زیدان

ترجمہ

ساجد الرحمن صدیقی کاندھلوی

شعبہ دعوت وارشاد

ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

فہرست مضامین

اختتام

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی محمد عبدہ ورسولہ وعلی الہ واصحابہ اجمعین، ومن تبعھم بالاحسان الی یوم الدین۔

اسلامی شریعت کے بارے میں اس حقیقت کا دوست اور دشمن سبھی اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلام اپنے جن اصولوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا انہی اصولوں کے ساتھ بلا کم وکاست اور بلا تحریف آج بھی موجود ہے۔ اس پر عمل سے آج بھی وہی برکات حاصل ہو سکتی ہیں جو ماضی میں مسلمانوں نے بارہا حاصل کر کے دکھا دیں۔ لیکن اس کی شرط اساسی یہ ہے کہ عصر حاضر کے مسلمان صحابہ کرام کی طرح اسلام کے عالمگیر اور عادلانہ پیغام انقلاب کو لے کر اٹھیں اور پہلے خود اس پر انفرادی و اجتماعی طور پر عمل کریں اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دیں۔ یہ ذمہ داری جس طرح ماضی میں مسلمانوں پر عائد تھی اسی طرح آج بھی عائد ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ماضی کے برعکس آج زمانہ اور اس کے مسائل، انسانی زندگی اور اس کے لوازمات اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہو گئے ہیں کہ ہماری تاریخ میں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ عصر حاضر میں علم بھی بڑا وسیع ہو چکا ہے۔ ہر چیز کو نئے نئے اسلوب میں اور نئے نئے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ہر چیز کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کیا جائے۔ پھر یہ بھی ایک طبیعی بات ہے کہ زمانے کے اعتبار سے لوگوں کے افہام وتفہیم کے اسالیب بھی بدلتے رہتے ہیں چنانچہ ایک داعی اسلام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اسلام کی دعوت

کو اپنے وقت کے مروجہ طرزِ بیان اور اسلوب ادا میں پیش کرے تاکہ نہ صرف اسے پیغام کو پیش کرنے میں آسانی ہو بلکہ دوسروں کی سمجھ میں بھی سہولت سے آسکے۔

زیرِ نظر کتاب "اصول دعوت دین" میں جناب ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے دعوت داعی اور اسالیب دعوت سے بحث کی ہے، آج اسلامی دعوت کا فریضہ انجام دینے والوں کو جن مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور ان مسائل کے حل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اسلام تو اپنی جگہ موجود اور اس کے اصول اٹل ہیں، ان میں تو کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں، ہاں اگر ایک داعی اسلام کو مشکل پیش آتی ہے تو اس میں کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے اسلام کا صحیح نمونہ بنا کر کیوں کر پیش کرے۔ پھر یہ کہ جن لوگوں کے سامنے نمونہ پیش کرنا ہے ان کو اور ان کے ذہن کو کیسے سمجھے؟ انہیں کس اسلوب میں سمجھائے؟ ان تینوں چیزوں کو سمجھ لینے کے بعد فریضۂ دعوت و تبلیغ کی انجام دہی کا کٹھن کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر زیدان کو دعوت دین سے کتنا لگاؤ ہے یہ تو اس کتاب کے مطالعے ہی سے معلوم ہو گا میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی دنیا میں اپنی دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی پوری زندگی یہی دعوت دینے میں گزری ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ انہوں نے اپنی پوری تدریسی زندگی میں بھی اسی نظریئے کے تحت کام کیا اور سینکڑوں ایسے شاگرد پیدا کر دیئے جنہوں نے میدانِ عمل میں نکلنے کے بعد اس نظریئے کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیا ہے اور اپنی پوری زندگی کو دعوتِ دین کے لئے وقف کر دیا ہے۔ چونکہ موصوف نے یہ کتاب بغداد یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے لکھی تھی اس لئے اس میں ان کا اسلوبِ نگارش بھی درسی کتابوں ہی کا ہے اور طلبہ کے لئے انتہائی مفید بھی۔ اسی درسی اسلوب کی وجہ سے یہ کتاب

مختلف عرب ملکوں کی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب بھی ہے ۔

ادارہ تحقیقات اسلامی اس کتاب کو اردو زبان میں شائع کرنے پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ اس سے جہاں طلبہ مستفید ہو سکتے ہیں وہاں عام قارئین کے لئے بھی اس کی افادیت کچھ کم نہیں۔ رب العالمین ہم سب کو اپنی رضا کے لئے اپنے دین کا داعی بنائے اور ہماری حقیر کوششوں کو قبولیت اور کامران سے سرفراز فرمائے ۔

امین یارب العالمین

تاج الدین ازہری (قاہرہ)

ابتدائیہ

اسلام کے مقاصد

انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کی ضمانت

قرآن وسنت کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا اوّلین اور اساسی مقصود بنی نوع انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح اور انسان سے ہر مضرت کو دُور کر کے اور ہر تکلیف سے بچا کر دائمی سعادت سے ہمکنار کرنا ہے۔ چنانچہ عزبن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ

اسلامی شریعت کے جملہ امور میں مضرت کو دُور کرنا اور انسانیت کے لئے کسی نہ کسی مصلحت کو حاصل کرنے کی خوبی کے حامل ہیں [1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ

شریعت اسلامیہ کا مقصود مصلحتوں کا حصول اور ان کی تکمیل اور مضرتوں کو دُور کرنا اور انہیں ختم کرنا ہے۔ [2]

امام ابن القیم جوزیؒ فرماتے ہیں کہ۔

شریعت اسلامیہ کی اساس و بنیاد دنیا اور آخرت کے مصالح ہیں اور اسی وجہ سے پوری شریعت انصاف اور رحمت پر مبنی ہے اور اس کے ہر پہلو میں مصلحت اور حکمت پنہاں ہے۔ [3]

اور شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ

---

[1]:۔ عزبن عبدالسلام: القواعد۔ ج ۱، ص ۹

[2]:۔ منہاج السنۃ النبویۃ، ج ۱، ص ۴۷، ج ۲، ص ۲۴۰، ج ۳، ص ۱۱۸ [3]:۔ اعلام الموقعین: ج ۲، ص ۱

شریعت بندوں کی مصالح کے لئے بھیجی گئی ہے۔ [1]

بلاشبہ یہ تمام اقوال صحیح اور درست ہیں اور قرآن وسنت کی نصوص ان کی مؤید ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو تمام انسانیت کے لئے سراپا رحمت کہا گیا ہے کیونکہ آپؐ کی شریعت انسان کی تمام مصلحتوں پر مشتمل اور ان تمام امور کی حامل ہے جن کی بنا پر انسان ہر مضرت، فساد اور نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے، اسی لئے ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۷)

اے نبیؐ ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

مصالح کی اقسام

شریعت اسلامیہ جن انسانی مصالح کا تحفظ کرتی ہے ان کی تین قسمیں ہیں۔

مصالح ضروریہ (وہ مصلحتیں جو انسان کی زندگی میں ناگزیر ضرورت کی حامل ہیں)

مصالح حاجیہ (وہ مصلحتیں جن کی تکمیل کی انسان کو احتیاج ہے)

مصالح تحسینیہ (وہ مصلحتیں جن کی تکمیل سے انسان کی زندگی میں عمدگی اور حسن پیدا ہوتا ہے)

اسلام کے بیشتر احکام انہی مصالح کے تحقق اور تحفظ پر مشتمل ہیں اور ان کی تکمیل سے بنی نوع انسان سعادتِ دنیا اور فلاح آخرت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

مصلحت اور فساد کا معیار

ہر مصلحت اور فساد کا حقیقی معیار اسلام ہے یعنی جس امر کو اسلام نے بتایا ہے کہ یہ انسان کے حق میں بہتر ہے وہ فی الواقع بہتر ہے اور جس شے کو اسلام نے انسان کے حق میں مضرت رساں بتایا ہے وہ درحقیقت مضرت رساں ہے اور جو شخص اسلام کے اس

[1]: الشاطبی: الموافقات، ج ۲ - ص ۶ -

معیارِ حق کے علاوہ کسی اور بات کو معیار بناتا ہے دراصل وہ متبع ہویٰ اور اپنی خواہشات کا پیروکار ہے اور ہویٰ سے امتیازِ خیر و شر نہیں کیا جا سکتا یعنی دو ہی پہلو ہیں، حق اور ہویٰ۔ حق تو اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے جو تمام مصالح اور مفاسد کے بیان اور وضاحت پر مشتمل ہے اور اسی لئے تقاضائے مصلحت ہی یہ ہے کہ حق کی اتباع کی جائے۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۔ (ص: ۲۶)

اے داؤد ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ بنایا لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے۔

انسان از خود مصلحت اور فساد سے واقف نہیں ہو سکتا۔

انسان طبعاً حقیقی مصالح کے ادراک اور دنیا اور آخرت کی سعادتوں تک رسائی حاصل کرنے کے طریقے کی دریافت سے عاجز ہے، اور اگر بالفرض انسان دنیاوی فلاح کے طریقے دریافت بھی کرلے تو یقیناً اخروی سعادت کا طریقہ دریافت کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے، سعادت اخروی انسان کو صرف شریعت کی اتباع اور ہدایت الٰہی کے نور سے مستفید ہونے ہی سے میسر آ سکتی ہے۔

انسان کی حقیقی مصلحت اسی میں ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی اتباع کرے۔

انسان کی حقیقی سعادت و فلاح صرف اسی میں ہے کہ وہ ہدایت الٰہی کی اتباع کرے اور اپنی پوری زندگی کے جملہ امور کو اسلام کے مطابق استوار کرے کیونکہ اسی سے حقیقی مصالح کی تکمیل اور دنیوی فلاح اور اخروی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور آخرت میں دارالنعیم میں جملہ نعمتیں میسر آ سکتی ہیں۔

اور یہی اسلام کی درحقیقت بہت بڑی خوبی ہے کہ اسلام پر عمل پیرا ہو کر انسان دنیا کی مطمئن اور خوشگوار زندگی سے محروم نہیں ہوتا بلکہ اسلام پر عمل سے اس کی زندگی لغزشوں اور مزلتوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی کا راستہ بھی سہل اور آسان ہو جاتا ہے اور انسان دنیا میں سلامتی سے زندگی گذار کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔ نہ یہاں بدبختیوں اور شقاوتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور رحمت الٰہی اسے وہاں کی کٹھنائیوں سے بھی محفوظ فرما لیتی ہے۔

دنیاوی مصالح، اخروی مصالح کے پیش نظر معتبر ہیں۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ

شریعت اسلامیہ کے مطابق انسان کے ان مصالح کا حصول اور ان مفاسد کا دور کرنا معتبر ہے جو اخروی نقطۂ نظر سے قابل اعتبار ہوں اور وہ مصالح اور مفاسد معتبر نہیں ہیں جو ہوائے نفس کے تحت مصالح یا مفاسد متصور کر لئے گئے ہوں [1]

اس کلام کا مقصود یہ ہے کہ اسلام جن امور کو مصالح قرار دیتا ہے اور ان کے لئے احکام وضع کرتا ہے تو اس کا مقصود انسان کو آخرت کی سعادت کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے کیونکہ مصالح دنیا بذات خود مطلوب نہیں ہیں بلکہ وہ مصالح اخروی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، اس لئے جو شے سعادت اخروی کے منافی ہو نہ قابل اخذ ہے، ظاہر ہے کہ آخرت کی دائمی نعمتوں اور وہاں کی ابدی سعادتوں کو دنیا کی فانی منفعتوں اور ختم ہو جانے والی لذتوں پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1]: الشاطبی: الموافقات، ج ۲، ص ۳۸۴۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ (النّٰزعٰت ۳۷-۴۱)

جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔ دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہے اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا۔ جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

اسی مفہوم کے پیش نظر امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ

آخرت کی مصالح اور وہاں کے مفاسد دنیا کے مصالح اور دنیا کے مفاسد پر مقدم ہیں یعنی کسی ایسی دنیاوی مصلحت کا اختیار کرنا ہرگز درست نہیں ہے جو آخرت کے نقطۂ نظر سے مصلحت نہ ہو کیونکہ جو بات آخرت کے نقطۂ نظر سے درست نہ ہو وہ باطل ہے اور مقصود شریعت کے خلاف ہے۔[1]

اس بیان کا یہ مطلب ہوا کہ درحقیقت جو بات غیر درست ہے وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہے بذات خود دنیا کا حصول اور اس کا استعمال (احکام الٰہی کے دائرے میں رہتے ہوئے) ممنوع نہیں ہے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا۔ (القصص: ۷۷)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے۔ اس سے آخرت کا گھر بنانے کی کوشش کر اور دنیا سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔

اسلام نے دنیا کو آخرت کی کھیتی اور اس کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے اس لئے یہ موزوں نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اس کھیتی کو برباد کر دے یا اس میدانِ عمل سے فرار حاصل کر لے اس لئے کہ انسان اس دنیا میں عمل کے لئے آیا ہے اور اس لئے آیا ہے کہ یہاں اعمال خیر تقوی اور عبادت الٰہی میں جان کھپائے یہی اس کا مقصد وجود ہے اس عظیم مقصد کو فراموش کر کے دنیا ہی کو مقصود اصلی بنا لینا درست نہیں ہو سکتا! اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ جس مرحلے پر دنیوی مصلحت اور

---

[1] :- ایضاً

اخروی مصلحت میں تضاد ہو، انسان اخروی مصلحت کو ترجیح دے اور دنیاوی مصلحت کو نظرانداز کردے اور کوئی افسوس اور ملال محسوس نہ کرے کہ درحقیقت اس کا کوئی نقصان اور گھاٹا نہیں ہوا ہے بلکہ یہ عین تقاضائے عقل ہے کہ بڑی اور عظیم ترین مصلحت کو چھوٹی اور معمولی مصلحت پر ترجیح دی جائے۔ اور بلاشبہ آخرت کی مصلحت دنیا کی مصلحت سے بڑھی ہوئی ہے اور بلحاظ کمیت اور کیفیت اور بلحاظ لذت اور راحت آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں کی آخرت کی لذتوں اور نعمتوں کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اس لئے کہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں میں محنتوں اور صعوبتوں اور تکالیف کی تلخیاں بھی شامل ہیں اور آخرت کی نعمتیں بے رنج وغم اور بلاتکلیف ہیں۔ آخرت کی نعمتیں تو ایسی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھی ہیں اور نہ کبھی کسی کان نے ان کی خوبی اور عمدگی کی صحیح کیفیت محسوس کی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہاں انسان اللہ کی رحمتوں، اس کے دیدار اور اس کی رضا سے بھی لطف اندوز ہوگا اور دنیا کی تمام نعمتیں ملا کر بھی رضائے الٰہی کی نعمت کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ آخرت کی نعمتیں لامتناہی، لازوال اور ابدی ہیں جبکہ دنیا کی نعمتیں متناہی، زوال آشنا اور وقتی ہیں اور ان کا زیادہ سے زیادہ عرصہ ایک انسان کی عمر کے برابر ہو سکتا ہے۔

ان امور کے پیش نظر ایک دانشمند مؤمن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دے کیونکہ شریعت اسلامیہ کا حکم یہی ہے کہ آخرت کو دنیا پر مقدم تصور کیا جائے اور خود انسان کی مصلحت بھی اسی میں ہے اور یہی مطابق حق ہے اور حق کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ضلال اور جہالت اور خسران ہے۔

پہلا باب

داعی اسلام

تمہید

ازروئے شریعت داعی وہ ہے جو دعوت الی اللہ کا مکلف ہو، اس لئے ضروری ہے کہ داعی کی تعریف اور اس کی ذمہ داریاں بیان کی جائیں اور ان امور کا بیان کیا جائے جن کی دعوت کے کام میں داعی کو ضرورت پیش آتی ہے اور اس اخلاق کا ذکر کیا جائے جو ایک داعی میں لازماً ہونا چاہئیں، اس لحاظ سے اس باب میں تین فصلیں ہوں گی۔

پہلی فصل : داعی کی تعریف
دوسری فصل : داعی کی ضروریات
تیسری فصل : داعی کا اخلاق

پہلی فصل

داعی کی تعریف

داعی اوّل

اللہ سبحانہٗ کی جانب اولین دعوت دینے والے ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ
بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ (الاحزاب: ۴۵ - ۴۶)

(اے نبی ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے اور ڈرانے والا بنا کر اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔)

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مستقل کار تبلیغ و دعوت انجام دیتے رہیں۔

وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (الحج: ۶۷)

(تم اپنے رب کی طرف دعوت دو یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو)

وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (القصص: ۸۷)

(اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو)

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ

(الرعد: ۳۶)

(تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس سے منع کیا گیا کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤں)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تا حیات کار تبلیغ و دعوت انجام دیتے رہے تا آنکہ آپ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

اللہ کی جانب دعوت تمام رسولوں کا طریقہ رہا ہے۔

تمام رسولوں اور جملہ انبیاء نے اللہ کی جانب بلانے اور دعوت دینے کا فریضہ انجام دیا ہے اور ان کی بعثت بھی بلا استثناء اسی مقصد کے لئے ہوتی تھی کہ وہ ان قوموں کو جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے ہیں انہیں اللہ کی طرف بلائیں اور انہیں ایمان باللہ کی دعوت

دیں اور انہیں ایک خدا کی عبادت کا اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہوا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (الاعراف : ۵۹)

(ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے)۔

حضرت ہودؑ کے ذکر کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (ہود : ۵۰)

(اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے)۔

حضرت صالح کے بارے میں فرمایا کہ

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (الاعراف : ۷۳)

(اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے)

اور حضرت شعیبؑ کے ذکر میں فرمایا کہ

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (الاعراف : ۸۵)

(اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے)۔

غرض تمام انبیاء نے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی ہے اور اس ذاتِ واحد کے سوا ہر ایک شے کی عبادت سے برأت کا اظہار کیا ہے، اور اللہ کے یہ منتخب بندے ہمیشہ دعوت الی اللہ کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۔ (النحل : ۳۶)

(ہم نے ہر امت میں اک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا۔ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو)

دعوت الی اللہ کے فریضہ کی ادائیگی میں امت بھی شریک ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ کا جو حکم دیا گیا ہے ان کا مخاطب آپؐ کی پوری امت ہے اور تمام مسلمان اس حکم میں داخل ہیں، کیونکہ اصول یہی ہے کہ جس امر (حکم) کا مخاطب جناب نبی کریمؐ کی ذات بابرکات ہو، اس کا مخاطب آپؐ کی پوری امت ہوتی ہے، الا یہ کہ اس سلسلے میں کوئی استثناء ہو اور اس بارے میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے۔

درحقیقت یہ اس امت پر اللہ جل شانہ کا فضل و کرم اور احسان ہے کہ یہ امت کارِ دعوت میں اپنے نبی کی شریک بنائی گئی ہے اور واضح الفاظ میں امت مسلمہ کو یہ کارِ نبوتؐ سپرد کیا گیا ہے

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۔ (آل عمران : ۱۱۰)

(اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو۔)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ امت خیر امت (بہترین امت) ہے اور اس وجہ سے خیر امت ہے کہ یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتی ہے اور یہی وہ کام ہے جو انبیاء اور رسول انجام دیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اولین مرحلہ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کی دعوت دی جائے اور شرک کی تمام انواع سے روکا جائے اور منع کیا جائے، جبکہ منافقین لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور انہیں ماسوا اللہ کی جانب بلاتے ہیں۔

وَالْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ۔ (التوبہ : ۶۷)

(منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبہ : ۷۱)

(مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔)

القرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے یہاں مومنین اور منافقین کے درمیان اصل اور حقیقی فرق و امتیاز یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اچھائیوں کی نصیحت اور برائیوں سے اجتناب کی تلقین اور دعوت اسلام مسلمانوں کا سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے۔[۱]

مزید یہ کہ اللہ سبحانہ نے جو وصف قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کیا ہے وہی وصف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔

---

[۱] : القرطبی، ج ۴، ص ۴۷

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ (الاعراف : ۱۵۷)

(وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے۔ ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے)

دعوت الی اللہ کا مکلف

اس بیان سے معلوم ہوا کہ ہر مسلم دعوت الی اللہ کے فریضہ کی انجام دہی کا مکلف ہے کیونکہ اجتماعی طور پر پوری امت دعوت کی مکلف ٹھہرائی گئی ہے اور ہر مسلم اس امت کا ایک فرد ہے اس لئے ہر عاقل و بالغ اور مرد و عورت پر دعوتِ اسلام فرض ہے اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ اسلام کی دعوت دینا صرف علماء اور مذہبی لوگوں ہی کا کام ہے۔ البتہ علماء کا کام یہ ہے کہ وہ کارِ دعوت کی تفصیلات بیان کریں اس کے احکام کی وضاحت کریں اور اس کی دلنشیں انداز میں تشریح کریں۔

اس امر کی وضاحت کہ کارِ دعوت ہر مسلمان پر فرض ہے اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یوسف : ۱۰۸)

"(تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور آپؐ پر ایمان لانے والے کامل علم و یقین کے ساتھ اللہ کی جانب دعوت دیتے ہیں جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے علم اور یقین کے ساتھ دعوت الی اللہ دی، یعنی دعوت الی اللہ مسلم کے ایمان کا ایک لازمی خاصہ ہے اور اس دعوت سے پہلو تہی اس کے ایمان کی کمی پر دلالت کرتی ہے جس کی اصلاح د

تکمیل اسے دعوت الی اللہ کے کلام سے کرنی چاہیئے۔

امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں کو بتلادیں کہ آپ کا طریقہ اور آپؐ کی سنت یہ ہے کہ آپؐ لوگوں کو یقین و بصیرت اور اذعان و برہان کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کی جانب بلائیں اور یہی طریقہ آپؐ پر ایمان لانے والے تمام مومنین کا ہونا چاہیئے کہ وہ بھی آپؐ کی پیروی کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو پورے یقین کامل ایمان اور قوت برہان کے ساتھ دعوت الی اللہ دیں۔[۱]

اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ
موجود شخص غیر موجود تک اس دعوت کو پہنچا دے۔[۲]

یہاں پر موجود شخص (شاہد) سے ہر وہ مسلم مراد ہے جسے دین کی کسی بات کا علم ہو یعنی دین کی جس بات کا علم جس شخص کو ہے اسے اس کا دوسروں تک پہنچانا لازم ہے۔

بہر حال دعوت الی اللہ، ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ ہر مسلم اپنی انفرادی حیثیت میں کار دعوت کو انجام دے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کچھ افراد اور رجال کار مل کر فریضۂ دعوت ادا کریں، جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران - ۱۰۴)

(تم میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے)۔

۱: تفسیر ابن کثیر : ج ۲، ص ۱۹۵، ۱۹۶

۲: صحیح البخاری : ج ۱، ص ۶۲، ۶۳

امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس امت میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو بہم دعوت میں مصروف رہے اگرچہ ہر مسلم کو انفرادی حیثیت میں بھی اس فریضہ کو ادا کرنا چاہیئے کیونکہ فرمان نبوتؐ ہے کہ تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے اس کو بدلنے کی سعی کرے اور اگر یہ بھی قدرت نہ ہو تو دل میں ضرور برا سمجھے جو ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

اگر کار دعوت عظیم الشان ہو جس کی انجام دہی کے لئے اجتماعی قوتیں درکار ہوں تو ایسے حالات میں داعیانِ حق کو اجتماعی جدوجہد کرنی چاہیئے، مثلاً اگر دعوتِ دین کا کام کسی بت پرست اور جاہلی معاشرے میں انجام دینا مقصود ہو یا کسی ایسے ماحول میں دعوتِ دین کا کام درپیش ہو جہاں کے لوگوں پر شیطانیت کا غلبہ ہو اور وہ بت پرستی اور جہالت کے اندھیروں میں گھرے ہوئے ہوں تو ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے اور اس طرح کے ماحول میں بہت زیادہ منظم اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اور ان حالات میں انفرادی کوششیں مفید نہیں ہو سکتیں۔ دعوتِ دین کے لئے اجتماعی جدوجہد کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان قبول کرنے والے کو دارالہجرت (مدینہ منورہ) بلا لیتے تاکہ اس کی قوتیں اور صلاحیتیں اس قافلۂ ایمان میں شامل ہو جائیں اور آپؐ کی ہدایات اور رہنمائی سے وہ کار دعوت و تبلیغ کے لئے تیار ہو جائے۔

اسی طرح قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ ۲)

(جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں۔ ان میں سب سے تعاون کریں۔ اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کریں)۔

یہ آیت واضح طور پر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دعوت دین کے لئے اجتماعی جدوجہد

ضروری ہے کیونکہ معاشرے میں بڑی نیکی، اور تقوی کا فروغ اسی وقت ہوگا جب ان امور میں اجتماعی تعاون عمل میں لایا جائے گا۔

ابوبکر جصاص نے حضرت امام ابو حنیفہ رح کا بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اجتماعی محنتیں صرف کی جانی چاہئیں۔

کارِ دعوت کی انجام دہی کے بارے میں شبہات اور ان کے جوابات

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ کارِ دعوت صرف مذہبی افراد کا فریضہ ہے۔ یا یہ کہ یہ ایک فرضِ کفایہ ہے جو علماء انجام دے رہے ہیں اور باقی لوگوں کو اس کام میں لگنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہی اس آیت کا مفہوم ہے

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اس شبہ کا جواب وہی ہے جو ہم اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں ابن کثیر رح کی طرف سے تحریر کر چکے ہیں کہ وہ اس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو پیہم اور مسلسل دعوت دین میں مصروف رہے ورنہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ہر فرد پر دعوت دین فرض ہے۔ چنانچہ امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں منکم کے بارے میں دو اقوال ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ یہاں مِن برائے تبعیض نہیں ہے کیونکہ اولاً اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام امت کا فریضہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

ثانیاً یہ کہ ہر مکلف پر اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے حسب استطاعت امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کرنا فرض ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم ایسی امت بنو جو خیر کی داعی معروف کی آمر اور منکر کی ناہی ہو۔ بہر حال اس آیت میں مِنْ تبعیض کے لئے نہیں ہے بلکہ بیان کے لئے ہے جیسا کہ اس فرمان الٰہی میں ہے

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔

امام رازیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مِنْ تبعیض(۳) کے لئے ہے کیوں کہ بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو کارِ دعوت کو انجام دینے اور امر بالمعروف کرنے اور نہی عن المنکر کرنے پر قدرت ہی نہ رکھتے ہوں، اس لئے یہ ذمہ داری علماء کی ہوگی کہ وہ دعوتِ دین کے فریضہ کو انجام دیں کیونکہ دعوت کا تعلق خود علم سے ہے اس لئے جہال سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی اور ظاہر ہے کہ علماء امت کا بعض حصہ ہوں گے[۱] یہی مفہوم ان دونوں آراء کے بیان کے ساتھ قرطبی اور جصاص نے بھی ذکر کیا ہے[۲] مگر رازیؒ نے جو رائے ذکر کی ہے اور جس کو ابن کثیرؒ نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے اور بہر حال عمومی طور پر دعوتِ دین ہر شخص پر فرض ہے جبکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مخصوص جماعت ایسی بھی ہو جو پیہم اسی کام میں مصروف رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کے صحیح فہم میں دو امور خارج ہیں، ایک تو یہ کہ اُمّۃٌ (جماعت) کی تفسیر علماء کی جماعت سے کی گئی کہ دعوت کے لئے علم لازمی ہے اور دوسرے یہ کہ دعوت دین کے فرض کفایہ ہونے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اس لئے ضروری ہے کہ ان دونوں امور کو بخوبی منقح کر دیا جائے۔

بلاشبہ دعوت الی اللہ کی لازمی شرط علم ہے لیکن علم ایسی شے نہیں ہے کہ اس کا کوئی تجزیہ نہ ہو سکے بلکہ اس کے اجزاء اور حصے ہو سکتے ہیں یعنی اگر ایک شخص دین کی

---

۱ : تفسیر الرازی ؛ ج ۷ ، ص ۱۷۷ ، ۱۷۸۔

۲ : الجصاص احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۹ وتفسیر القرطبی ج ۴ - ص ۱۶۵ -

(۳) من (سے) عربی قواعد کے لحاظ سے تمام افراد میں سے بعض کے ذکر کرنے کے لئے ہوتا ہے اسے من تبعیض کہتے ہیں۔ س۔ صدیقی

ایک بات جانتا ہے تو وہ اس بات کی حد تک عالم ہے اور اس کے علاوہ امور میں جاہل ہے اور جس بات کو جانتا ہے اس کی دعوت دینے کی شرط پوری ہو گئی اور اس کی اسے دعوت دینی چاہیئے لیکن جن امور سے وہ ناواقف ہے ان کی ہرگز دعوت نہ دے اور نہ اس کی دعوت دینا اسے جائز ہے یعنی ہر مسلمان پر اس حد تک دعوت دین فرض ہے جس حد تک اسے دین کا علم ہو، اور یہی اس بات کا مطلب ہے کہ دعوت علماء پر فرض ہے۔ یعنی اس شخص پر فرض ہے جو دین کی کوئی بھی بات جانتا ہو، خواہ وہ عام مسلمانوں میں سے ہو یا کوئی بہت بڑا عالم ہو، بہرحال یہ کہنا درست نہیں ہے کہ دعوتِ دین کا کام انجام دینا کسی خاص مذہبی طبقے کی ذمہ داری ہے یا علماء کے ایک مخصوص گروہ کا فرض ہے اس لئے کہ تمام مسلمان ہی اسلام کے پیروکار اور اس کے مبلّغ ہیں۔

فرض کفایہ کے اس مفہوم سے بھی التباس پیدا ہوا ہے کہ فرض کفایہ اگرچہ تمام مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے لیکن اگر بعض افراد اسے انجام دے لیں تو باقی افراد کے ذمے سے ساقط ہو جاتا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ جو اصحاب مِنْ کو بیانیہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعوت کا کام تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کارِ دعوت اگرچہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے لیکن بعض افراد کے انجام دے لینے سے یہ ذمے داری ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی مثال۔

انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا (التوبہ - ۴۱)

(اور نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل)

اور

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (التوبہ - ۳۹)

(تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا)

ہے کہ ان آیات میں بھی اگرچہ حکم عام ہے مگر اگر ایک جماعت اس فرض کو انجام دے لے تو باقی افراد سے یہ ذمے داری ساقط ہو جائے گی۔[1]

ابوبکر جصاص۔ ولتکن منکم امۃ۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے۔

---

[1]: الرازی ج ۷ - ص ۱۷۷۔

اور دوسرے یہ کہ یہ فرض کفایہ ہے کہ اگر کوئی شخص انجام دے لے تو باقی کے ذمے سے ساقط ہو جائے [1] اس کا مطلب یہ ہے کہ فرض کفایہ کچھ افراد کے انجام دینے سے ساقط ہو جاتا ہے جبکہ فرض عین اس وقت تک ساقط نہیں ہوتا جب تک تمام افراد اس کو انجام نہ دیں۔ اس لئے دعوت الی الخیر اور دعوت الی اللہ ہر مسلمان پر لبقدرِ استطاعت لازم ہے کیونکہ دعوت الی اللہ مؤمن کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جیسا کہ حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان لبقدرِ استطاعت منکر کو دور کرے اور جب یہ مقصود کچھ افراد کی سعی سے حاصل ہو جائے تو باقی افراد اس منکر کے ازالے کے سلسلے میں جوابدہ نہ رہیں گے اور مسلمان کا اصل اور حقیقی وصف یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سبقت کرے اور کسی دوسرے کا انتظار نہ کرے کہ ہو سکتا ہے وہ دوسرا بھی اس فریضہ کو انجام نہ دے اور سب ہی گناہ گار ہو جائیں۔

مسلمان تو دعوتِ الی اللہ دیتا ہی اسی لئے ہے کہ وہ مسلم ہے اور اسے اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان ہے جیسا کہ ہم نے فرمانِ الٰہی نقل کیا ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یوسف - ۱۰۸)

(تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے)

غرض مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ کارِ دعوت انجام دے اور اگر کسی وقت وہ کارِ دعوت و ارشاد انجام نہ دے اور دوسرا کوئی مسلمان اس فرض کو انجام دے تو ظاہر ہے کہ اجر و ثواب کا مستحق بھی یہ دوسرا ہی ہو گا، لیکن اگر کوئی شخص مستقل کارِ دعوت کو ترک کر دے

[1]: الجصاص : ج ۲، ص ۲۹

تو وہ اس آیت کے مفہوم سے خارج ہو جائے گا۔

قل هذه سبیلی ادعوا الی الله

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور پیروکار وہی ہیں جو اللہ کی جانب بلانے کے اس فریضہ کو سرانجام دیں جو خود سرکارِ دو عالمؐ نے انجام دیا۔

دراصل فرض کفایہ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ فرض اگرچہ تمام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اور ان پہ لازم کرتا ہے کہ وہ اسے بروئے کار لانے کی سعی کریں اور جس شخص کو اس کے انجام دہی کی قدرت حاصل ہو وہ اسے عملاً اور اسی وقت انجام دے اور ولتکن منکم امة یدعون الی الخیرو یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر بھی اسی مفہوم میں ہے کہ ایک جماعت ہو جو ہر وقت دعوت الی اللہ میں مصروف رہے اور تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی جماعت کے قیام کی سعی کریں اور اس کی ہر طرح کی تائید و نصرت کریں اور دعوتِ دین کی اشاعت میں ان کی پوری پوری مدد کریں، اگر مسلمان ایسا نہیں کرتے تو وہ گناہ گار ہوں گے، جو دعوت کے اہل ہیں وہ بھی ہیں اور جو نہیں ہیں وہ بھی[1]۔

اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ دعوت الی اللہ امت کے بعض افراد کے ذمے بطور فرض کفایہ لازم ہے اور تمام افراد پر نہیں ہے تو بھی ہم یہ کہیں گے کہ فرض کفایہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس فرض کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دے دیا جائے کہ اس کی جس قدر ضرورت ہے وہ پوری ہو جائے لیکن اگر یہ ضرورت پوری نہ ہو تو تمام امت پہ یہ فرض عائد ہو گا کہ وہ اس فرض کی تکمیل کی سعی کرے اور دعوت دین کی آج جس قدر ضرورت ہے اور جس طرح شرک و بت پرستی اور جاہلیت میں امریکہ اور افریقہ کے بہت بڑے بڑے علاقے گھرے ہوئے ہیں اس کا لازمی تقاضا ہے کہ دعوتِ دین کا فریضہ

---

[1] : عبداللہ دراز نے بھی اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ الموافقات، ج ۱/ ص ۱۷۶

ہر مسلمان انجام دے اور اپنی تمام قوتوں، صلاحیتوں اور اپنے جان اور مال اور اپنے علم اور اپنی فکر اور اپنے اختیار اور اقتدار کو اسلام کی اشاعت میں لگائے۔

بعض حضرات دعوت دین کی ذمے داریوں سے بچنے کے لئے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کی اصلاح کافی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(المائدۃ : ۱۰۵)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اپنی فکر کرو کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود ہدایت پر ہو)

یہی وہم بعض لوگوں کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانے میں ہوا تو آپؓ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا،

اے لوگو تم اس آیت علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھدیتم کا مطلب غلط سمجھے ہو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر لوگ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو خطرہ ہے کہ سب عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں [۱]

خود یہ آیت دعوت کے وجوب پر دلالت کر رہی ہے کہ اس میں کہا گیا ہے اذا اھتدیتم اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ہدایت تو اس فرض کی ادائیگی سے ہی مکمل ہو گی یعنی جب ایک مسلم جس قدر فرائض اس پر عائد ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جس قدر ذمے داریاں ہیں انہیں پورا کرے تو اس وقت اس کے لئے کسی اور کی گمراہی نقصان دہ نہیں رہے گی [۲]

---

۱ : نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، السید صدیق حسن خان، ص ۲۵۱۔ الجصاص ج ۲، ص ۲۱

۲ : ابن تیمیہ : الحسبۃ، فی مجموعۃ رسائل، ص ۲۷۵۔

ایک شبہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج کل باطل اس قدر پھیل گیا ہے اور گمراہی اس قدر محیط ہو گئی ہے کہ اب دعوتِ دین کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہا ہے اور اب تو یہی صورت ہے کہ آدمی صرف اپنے دین کا تحفظ کرے اور دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔

اس شبہ کا جواب جیسا کہ ہم بعد میں اس کی تفصیل بھی بیان کریں گے یہ ہے کہ کارِ دعوت ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ اس کا مقصد حاصل ہو یا نہ ہو اور خواہ اس دعوت پر کوئی لبیک کہے یا نہ کہے، خود اللہ سبحانہٗ نے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ داعیانِ حق نے اس کا ۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۶۴، ۱۶۵)

(جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے۔ یا سخت سزا دینے والا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں پس جب اُن ہدایات کو فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا۔ جو برائی سے روکتے تھے۔ اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا)

اس آیت میں جس بستی کا ذکر ہے وہاں کے لوگوں کے تین گروہ تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جو معاصی میں مبتلا اور گناہوں میں گھرا ہوا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جو انہیں وعظ و نصیحت کرتا تھا اور تیسرا گروہ خاموش تماشائی تھا اور سمجھتا تھا کہ اب قوم کو وعظ و نصیحت کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔ اور وہ نصیحت کرنے والے لوگوں سے کہتے کہ جس قوم کے حق میں اس کی

بداعمالیوں کی بنا پر ہلاکت اور عذاب مقدر ہو چکا ہے تو اب تم انہیں سمجھا کر کیا کرو گے۔ تو انہوں نے اس کا جواب دیا کہ ہم اس لئے ان کو برائیوں پر ٹوک رہے ہیں تاکہ رب کے پاس ہم کوئی عذر پیش کر سکیں کہ اے خدا ہم ان نافرمانوں کو ہدایت تو نہیں دے سکتے تھے مگر ہم نے آپ کے عائد کردہ فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بخوبی انجام دیا اور اس توقع پر انجام دیتے رہے کہ شاید یہ اب بھی راہ راست پر آجائیں۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جب تک دعوتِ حق کا احتمال بھی باقی ہے دعوت و ارشاد اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تاکہ جو زندہ رہے وہ اپنے رب کی برہان (دلیل) کے ساتھ زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو۔

بعض حضرات کو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا سے بھی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ دعوتِ دین کے کام کی جو ذمے داریاں اور تکالیف ہیں وہ ان کے برداشت کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس لئے اس آیت کے تحت وہ اس ذمے داری سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ دراصل ایسی دلیل ہے جس کا مصدر ایمان کی کمزوری ہے کیونکہ جس تکلیف اور صعوبت کے وہ دین کے کام میں شاکی ہیں وہی صعوبت اور تکلیف، بلکہ اس سے کہیں زیادہ زحمتیں وہ حصول دنیا کے لئے برداشت کرتے ہیں اور معمولی سی منفعت اور حقیر سے فائدے کے لئے بے حد جد و جہد کرتے ہیں حالانکہ اسلام کی تبلیغ کے راستہ میں ہونے والی تکلیف اور زحمت دنیا کے راستے میں اٹھائی جانے والی زحمتوں اور صعوبتوں سے بہت کم ہیں، ظاہر ہے کہ کسی ناواقف کو اسلام کی کوئی بات بتا دینے یا کسی منکر کو اسلام کی کسی حقیقت کو سمجھا دینے میں کیا زحمت ہو سکتی ہے؟ کیا انسان اگر کلمۂ طیب اور کوئی اچھی بات کہے تو اس کی زبان تھک جائے گی! کیا اگر کوئی اسلام کی اشاعت اور اس کے فروغ کے بارے میں غور و فکر کرے

---

[1] : تفسیر ابن کثیر: ج ۲، ص ۲۵۰۔

تو اِن کا ذہن تھک جائے گا؟ کیا غیر مسلم علاقوں میں جاکر تبلیغ دین کرنا دنیا کے امور کے لئے کی جانے والی جدوجہد سے بھی زیادہ سخت ہے؟ اور کیا عیسائی مشنری سالہا سال تک غیر ممالک میں جاکر تبلیغ کرتے ہیں وہ یہ تعب اور دشواری محسوس کرتے ہیں؟

حالانکہ ایک مسلم کی ایک عیسائی مشنری کے بالمقابل زیادہ بڑی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے دین کے فروغ کی جدوجہد کرے اور ہر جگہ اسلام کی روشنی پھیلائے اور اس سلسلے میں پیش آنے والی ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے کیونکہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔ (النساء : ۱۰۴)

(اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔)

صحابۂ کرام کی زندگیاں دیکھیے کہ انہوں نے دعوتِ اسلامی کے راستے میں کس قدر تکلیفیں برداشت کیں اور انہوں نے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسی جدوجہد اور اسی جہادِ حق میں کھپا دیں۔

غزوۂ احد کے بعد جب سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور آپؐ کے ساتھ تمام صحابہ واپس آگئے تو یہ اطلاع آئی کہ ابو سفیان اور اس کے ساتھ کفار کی ایک ٹولی مسلمانوں کے استیصال کی نیت سے مدینہ کی جانب دوبارہ رخ کر رہے ہیں تو آپؐ نے بعد نماز صبح حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کردیں کہ جو اصحاب ہمارے ساتھ کل شریک جہاد تھے آج بھی وہ دشمن کے مقابلے کے لئے تیار ہو کر آجائیں، اس اعلان کو سن کر حضرت سعد بن معاذؓ آپؐ کی جانب روانہ ہوئے اور راستے میں اپنے اہل قبیلہ اور خاندان والوں کو حاضری کے لئے فرماتے جاتے تھے حالانکہ سب زخمی تھے۔ اسید بن حضیر کے جسم پر

سات زخم لگے ہوئے تھے اور وہ ان پر دوا لگانے والے تھے مگر سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور پکار اٹھے کہ میں اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے حاضر ہوں، سعد بن عبادہ اپنی قوم کے ساتھ آگئے۔ ابو قتادہ اپنی جماعت کے ساتھ آگئے، بنو سلمہ کے چالیس زخمی بھی آگئے، طفیل بن نعمان کے جسم پر تیرہ زخم تھے وہ بھی آگئے اور حارث بن صمہ کے دس زخم تھے اور اس کے باوجود وہ بھی خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہو گئے اور سرکار رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ اے اللہ بنو سلمہ پر اپنی رحمتیں نازل فرما[1]

یہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد اور یہ تھا صحابہ کرامؓ کے آپؐ کے ساتھ شریک جہاد ہونے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی سعی کا نمونہ! کیا اس اسوۂ کریم کے پیش نظر ہوتے ہوئے بھی مسلمان دعوت الی اللہ کی سعی و جہاد محاسن السلام کی اشاعت اور اسلامی اخلاق کے عملی مظاہرے کی معمولی سی سعی بھی نہیں کریں گے؟ حالانکہ وہ دیکھ رہے کہ صحابہ رسول اللہؐ زخمی ہونے کے باوجود اللہ اور رسولؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں پھر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

مسلمان پر دعوت الی اللہ کی ذمے داری ہونے کی وجوہ:

گذشتہ بیان سے بدلائل معلوم ہو گیا ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر دعوت الی اللہ کا فریضہ عائد ہے یعنی یہ کہ اسلام صرف اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ مسلم بذات خود ہدایت یافتہ اور صالح ہو بلکہ اسلام کی نظر میں یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم بذاتِ خود ہدایت یافتہ اور صالح ہونے کے ساتھ ساتھ مصلح اور ہادی بھی ہو اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپؐ کی رسالت تا قیامت تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔

[1]: المقریزی: امتاع الاسماع ص ۱۷۰

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (الاعراف : ۱۵۸)

(اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں)

اور اس رسالت کا مقصود تمام مخلوقات کی ہدایت ہے تاکہ پوری انسانیت سعادت اخروی اور فلاح دنیا حاصل کر سکے اور اس رحمت کی مستحق بن سکے جو آپ کی ذات کے ساتھ اس دنیا میں نازل کی گئی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء: ۱۰۷)

(اے نبی ہم نے تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

رسول کریمؐ کے اس دعوت حق کو پہنچا دینے اور خود ملاء اعلیٰ واصل ہو جانے کے بعد ضروری ہوا کہ یہ فریضہ دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت مسلمان خود انجام دیں اور تا قیامت لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لاتے رہیں۔

الٓرٰ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ (ابراہیم : ۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعد آپ کے اُمتی ہی مخلوقات پہ اللہ کے گواہ ہیں اور ان کی دعوت کو آگے بڑھانے والے ہیں۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (البقرة : ۱۴۳)

(اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے۔ تاکہ تم دنیا کے لوگوں پہ گواہ ہو اور رسول تم پہ گواہ ہو)

کا دعوت کے فریضہ کو ادا کرنا انسانیت کی عظیم خدمت ہے کہ مسلم انہیں شرک کی گندگیوں، بت پرستی کی آلودگیوں اور جاہلیت کی کثافتوں سے نجات دلا کر صراط مستقیم کی جانب راہنمائی کرتا ہے اور اس مقصد عظیم کو پورا کرتا ہے جو انسانیت کا اللہ نے مقدر فرمایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات : ۵۶)

(میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)

دوسری وجہ یہ ہے کہ شرک اور کفر کا روئے زمین پر باقی رہنا خود اسلام کے قیام پر اثر انداز ہوتا اور اس کے کسی نہ کسی پہلو کو متاثر کرتا ہے، اسی لئے اسلام نے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مستقل دارالکفر میں رہے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ دارالاسلام منتقل ہو جائے، اس سے پہلے کہ دارالکفر میں اس کا قیام اس کے دین، اس کے ایمان اور اس کے اسلام کو متاثر کرے۔ چنانچہ فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء : ۹۷)

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے۔ ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا، تم کس حال میں ہو۔ انہوں نے جواب دیا ہم زمین پر کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی۔ کہ تم اس میں ہجرت کرتے یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جو بہت برا ٹھکانا ہے)۔

یہ آیت ان تمام مسلم افراد کے بارے میں ہے جو مشرکین کے درمیان گھرے ہوئے ہوں اور وہاں سے ہجرت کر سکتے ہوں اور وہاں رہتے ہوئے دین اسلام قائم نہ کر سکتے ہوں تو ان کا وہاں قیام حرام اور ناجائز ہے[1]۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ جس سرزمین میں کھلم کھلا منکر کیا جاتا ہو اس سرزمین کو ترک کر دو اور وہاں قیام نہ کرو[2]۔

---

[1] - تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۴۲۔

[2] - تفسیر القرطبی، ج ۱۲، ص ۲۹۱

غرض مسلمان کا کفار اور مشرکین کو دعوت اسلام دنیا اور دین کی اقامت کی سعی کرنا خود اس کے لئے مفید ہے اور خود مسلمانوں کو کفر کی برائیوں سے بچانے والا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دعوتِ دین کے فریضہ کی انجام دہی سے مسلمان ہلاکت اور عذاب سے، برحمت الہٰی محفوظ ہو جائیں گے۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (الانفال : ۲۵)

(اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو اور جان رکھو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ ایسے ماحول میں نہ رہیں جہاں ان کے سامنے منکر موجود ہو اور اللہ کا عذاب آئے تو وہ نیکوکار اور بدکار ہر دو کو شامل ہو جاتے۔ اور مسلم میں حضرت زینب بنت جحش سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کیا جب ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں تب بھی ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا، ہاں جب برائی کی کثرت ہو جائے گی۔[1]

داعی کی حالت اور اس کی قدرت کے مطابق دعوت الی اللہ

دعوت الی اللہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور ہر داعی پر یہ فرض اس کی قدرت کے مطابق اور اس کی حالت کے مطابق عائد ہوتا ہے اور اگر قدرت نہ ہو تو یہ فرض عائد نہیں ہوتا اور قدرت کے مفہوم میں علم اور سلطان (اختیار) داخل ہیں یعنی عالم پر جو ذمے داریاں ہیں وہ جاہل پر نہیں ہیں اور جو صاحب اختیار شخص پر ذمے داریاں عائد ہیں وہ عام مسلمانوں

---

[1] : القرطبی، ج ۱، ص ۲۹۰

پر نہیں ہیں، اسی لئے حق سبحانہٗ نے اہل علم کے کتمان علم پر وعید فرمائی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ (البقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

(جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ درآں حالانکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں۔ اور ظاہر کر دیں۔ ان کو میں معاف کر دوں گا۔ اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور معاف کرنے والا ہوں۔)

اس آیت میں اہل علم کا یہ فرض بیان کیا گیا ہے جو کچھ انہیں اسلام کے بارے میں علم ہو وہ اس سے دوسروں کو ضرور آگاہ کر دیں اور انہیں شرک کی مضرتوں سے بچائیں اور اسلام کے بارے میں جسے جو بات معلوم ہے وہ اس کا عالم ہے اور اس پر اس بات کا اس شخص تک پہنچانا لازم ہے جو اسے نہیں جانتا، کہ علم کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کے حصے نہ ہو سکیں بلکہ علم کے حصے ہو سکتے ہیں اور اس کے اجزاء ہو سکتے ہیں، یعنی ہر مسلمان یہ تو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اسلام کے فرائض خمسہ ہیں اور یہی کچھ اس پر پہنچانا اور تبلیغ کرنا لازم ہے اور جن امور سے وہ ناواقف ہو ان کی تبلیغ اور ان کی دعوت اس پر لازم نہیں ہے۔

قدرت کی دوسری صورت اختیار، غلبہ اور اقتدار ہے، اور اللہ سبحانہٗ نے قرآن کریم میں صحابہ کرام کو حکم دیا ہے کہ اللہ نے ان کو جو غلبہ اور اقتدار دیا ہے وہ اسے فضائل اعمال کی اشاعت اور عبادت الٰہی کے فروغ میں صرف کریں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج: ۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین پر اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ

دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے)

اہل تفسیر کہتے ہیں کہ زمین میں تمکن (غلبہ) رکھنے والے افراد حکمراں اور علماء ہیں[1] غرض جس مسلمان کو غلبۂ اقتدار اور اختیار حاصل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اقتدار کی وسعت کے بقدر روئے زمین پر اللہ کی عبادت کو جاری کرائے اور اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جاری کرے اور لوگوں کو شرک اور اس کی تمام انواع سے روکے، جیساکہ شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے امام (حکمراں) کے مقرر کرنے کا مقصود ہی یہی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دے۔[2]

اسلامی نظام حکومت میں حکمراں اس اصول پر عمل کرتے رہے ہیں چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے تمام گورنروں کو یہ خط تحریر فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ[3]

(حم السجدۃ : ۳۳).

(اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔)

حقیقت یہ ہے کہ حکمرانوں کا دعوتِ اسلامی کے فرائض کو انجام دینا بہت بڑے اور مفید نتائج کا حامل ہو سکتا ہے کہ اقتدار اور سلطان احکام اسلامی کے عملاً انفاذ

---

[1] : القرطبی، ج ۱۲، ص ۷۳۔

[2] : ابن تیمیہؒ : السیاسۃ الشرعیہ، ص ۷۷

[3] : عبداللہ بن عبدالحکم : عمر بن عبدالعزیزؒ، ص ۹۴ ۔

کے لئے ناگزیر ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ سبحانہٗ، اقتدار سے وہ اثرات مرتب فرما دیتا ہے جو قرآن سے نہیں ہوتے۔

داعی کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اور تمام احوال میں دعوت کا کام جاری رکھے۔

دعوتِ دین کے لئے صیام اور صلاۃ کی طرح وقت مقرر نہیں ہے بلکہ اس فرض کی ادائیگی ہر حالت، ہر وقت اور ہر صورتِ حال میں لازم ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت نوح ؑ کا قول مذکور ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا.... (نوح : ۵)

("اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو صبح و شام پکارا")

ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (نوح : ۹)

("پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔")

اسی طرح حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو شب و روز، رات اور دن، علیحدگی میں اور علی الاعلان تبلیغ دین کرتے تھے اور کسی بھی وقت دعوت کے کام سے غافل نہیں ہوتے تھے۔[۱]

اگر داعی اسلام اپنی دعوت میں صادق ہو تو وہ اسی کام میں منہمک رہے گا اور کوئی فکر اور کوئی عمل اسے اس سے غافل نہیں کر سکے گا اور وہ سخت ترین حالات میں بھی اپنی دعوتی جد و جہد کو جاری رکھے گا اور کسی بھی وقت اس کام سے پہلوتہی نہیں کرے گا۔

چنانچہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقعہ پر بھی کارِ دعوت سے پہلوتہی نہیں کی بلکہ جس وقت آپؐ مدینہ منورہ ہجرت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور آپؐ کی

---

[۱] :۔ المقریزی: امتاع الاسماع، ص ۱۸۔

معیت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے کہ آپؐ کو راستے میں بریدۃ بن الحصیب الاسلمی ملے آپؐ نے انہیں دعوتِ اسلام دی اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔[1]

یعنی جس کڑے وقت میں کفار آپؐ کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور آپؐ ہجرت کے لئے روانہ ہو چکے تھے آپؐ اس وقت بھی اسلام کی دعوت سے غافل نہیں ہوتے۔

حضرت یوسفؑ جیل میں جب پہنچتے ہیں اور دو قیدی آپؐ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھتے ہیں تو آپؐ دعوت دین کے فریضہ سے غافل نہیں ہوتے اور آپ نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

يَاصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (یوسف ۳۹، ۴۰)

(اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں۔ یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے اُن کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی فرمانروائی کا اختیار اللہ کے سوا کسی کو روا نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

داعی پر صرف فریضۂ دعوت کی ادائیگی لازم ہے اور لوگوں کا اس دعوت کا قبول کروانا اس پر لازم نہیں ہے

داعی حق کا فریضہ محض دعوت حق کا پہنچا دینا ہے اور اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی دعوت کو قبول بھی کروائے اس لئے کہ اللہ سبحانہٗ کا فرمان ہے۔

---

[1]: امتاع الاسماع، مقریزی ص ۴۲

وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (العنکبوت : ۱۸)

(" اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے")

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمے داری بھی صرف دعوتِ دین کو پہنچا دینا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کی امت پر بھی محض ابلاغ ہی فرض ہے اور اس کی دو وجوہ ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اصولی قاعدہ یہی ہے کہ کوئی بھی انسان دوسرے کے اعمال کا ذمے دار نہیں ہے کہ یہ ایسی شے کا مکلف بنانا ہے جو اس کی قدرت سے باہر ہے، لیکن اصولاً داعی اسی امر کا مکلف ہے کہ وہ دعوت حق دیتا رہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے، اگر وہ شخص جس کو دعوت دی گئی ہے اس دعوت پر لبیک کہتا ہے تو داعی اس کے اعمال حسنہ کا باعث اور سبب بنتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ نے اپنے ایک نبی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ (مریم : ۵۵)

(" وہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیتا تھا")

دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی کا دعوتِ حق کو قبول کر لینا اور ہدایت پا جانا اللہ سبحانہ کے حکم اور اس کی مشیت پر موقوف ہے، کہ وہی ہدایت دینے والا ہے۔

فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (ابراہیم : ۴)

(پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔)

غرض ہدایت بالکلیہ اللہ سبحانہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ چاہے تو تمام انسانوں کو ہدایت دے دے، لیکن جہاں تک تبلیغ، بیان اور دعوتِ حق کا تعلق ہے تو وہ تمام انبیاء اور رسل اور جملہ دعاۃ حق کا فرض رہا ہے اور اسی مفہوم میں جناب رسالت مآب کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (الشوریٰ : ۵۲)

(یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو")

مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور مقام پر یہ ارشاد فرمایا

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ۔ (القصص: ۵۶)

(اے نبی تم جسے چاہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)

خواہ ایک فرد بھی دعوت حق قبول نہ کرے داعی اپنے اس فرض کی انجام دہی جاری رکھے۔

چونکہ داعی پر صرف تبلیغ حق کا فریضہ ہی عائد ہے اور یہ اس کی ذمے داری نہیں ہے کہ لوگ لازماً ہدایت یافتہ ہو جائیں اس لئے داعی کو چاہیئے کہ وہ پیہم اور مسلسل امر دعوت کو انجام دیتا رہے اور اس میں قطعاً کوئی تکان کوئی ملال اور سستی محسوس نہ کرے اور جس طرح تمام عبادات حق سبحانہ' کی رضا کے لئے انجام دیتا ہے اسی طرح دعوتِ حق کو بھی ایک عبادت کی طرح محض رضائے الٰہی کے لئے انجام دیتا ہے، خواہ ایک فرد بھی اس کی دعوت پر کان نہ دھرے کیونکہ حضرتِ نوحؑ مسلسل ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم میں دعوت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، اور صرف حضرت نوحؑ ہی نہیں بلکہ تمام انبیاء اور رسولؑ اسی طرح دعوتِ حق کے فرض کو انجام دیتے رہے جن میں بعض کی قوموں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور بعض انبیاء کی قوموں نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔

حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اس کے ایسا سمجھنے سے اس سے یہ فرض ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس کے باوجود اس پر یہ فرض عائد رہے گا کہ نصیحت اور یاد دہانی بجائے خود مومنین کے حق میں نفع بخش ہے کیونکہ داعی پر صرف امر و نہی کی ذمے داری ہے اور اسے قبول کرانے کی ذمے داری اس پر نہیں ہے[1] امام سیوطیؒ نے

[1]: النووی: شرح صحیح مسلم، ج ۲، ص ۲۲۔

بھی اسی رائے کی تائید کی ہے [1]

کارِ دعوت کو مسلسل جاری رکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مایوسی حرام ہے اور اس امر کا پورا امکان موجود ہے کہ لوگ دعوت قبول کرلیں کیونکہ قلوب اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جب چاہے دلوں کی حالت تبدیل کرسکتا ہے، اس لئے داعی کو چاہیئے کہ وہ مسلسل اور پیہم دعوتِ حق کے فریضہ کو انجام دیتا رہے اور نتائج اللہ پہ چھوڑ دے۔

داعی حق کا صلہ اللہ کے ذمے ہے

داعی حق اللہ کے مقرر کردہ ایک فریضہ کو انجام دیتا ہے جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اس لئے داعی حق کسی انسان سے کارِ دعوت کا کوئی صلہ طلب نہ کرے اور کسی عزت، شہرت اور مال و متاع کا طالب نہ ہو۔ اللہ سبحانہٗ نے، حضرت نوحؑ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (یونس : ۷۲)

(تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں خود مسلم بن کر رہوں)

اور ہمارے سرکارؐ کا یہ فرمان قرآن میں آیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

یعنی صرف ایک رعایت تم میرے ساتھ کرو کہ میری تمہارے ساتھ قرابت داری کا لحاظ کرکے میرے دعوت الی اللہ کے کام میں رکاوٹیں نہ کھڑی کرو اور لوگوں کو اس راہِ حق کے قبول کرنے سے نہ روکو۔

اللہ سبحانہ کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبر اور تمام رسول اسی طرح بغیر کسی جزا اور صلہ

[1] : السیوطی : الاشباہ والنظائر ص ۳۰۷

کی امید اور توقع کے دعوتِ حق کے فرض کو انجام دیتے رہے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ○ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ ○ (یٰس : ۲۰، ۲۱)

("اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اور بولا اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کرو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں")

اسلام میں داعی کا مقام

اسلام کی نظر میں داعی حق کا مقام بہت بلند اور عظیم ہے اور اس کی دعوت الی اللہ کی بات دنیا کے ہر کلمہ اور ہر بات سے افضل ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

(حمٰ السجدۃ : ۳۳)

("اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کئے اور کہا کہ میں مسلمان ہوں")

یہ آیت تمام اہلِ دعوت کو عام ہے یعنی جو داعی حق خود بھی باعمل ہو، فرائض ادا کرتا اور محارم سے بچتا ہو[1] اس کا قول بہترین قول ہے بالخصوص انکار اور تمرد کے حالات میں داعی کا کلمۂ حق کہنا سب سے بڑی فضیلت ہے اور اس کا اجر اللہ بہت زیادہ دینے والا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذلک من اجورھم شیئًا۔

---

[1]: تفسیر ابن کثیر: ج ۴ ص ۱۰۰۔

(جو شخص ہدایت کی جانب بلائے تو اسے ان تمام لوگوں کے اجر کے بقدر اجر ملے گا۔ جو اس کی اتباع کریں گے۔ اور ان کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ

فواللہ لان یہدی اللہ بک رجلاً واحداً خیرلک من حمرالنعم

(قسم بخدا تمہارے ذریعے سے اللہ کا کسی ایک شخص کو ہدایت دے دینا تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے)

اور ایک حدیث ہے کہ

من دل علی خیر فلہ مثل اجر من عملہ

(جو شخص کوئی خیر کی بات کسی کو بتلائے تو کرنے والے کی برابر اسے اجر ملے گا۔

دوسری فصل

داعی کی ضرورت

①

شعور کامل

کارِ دعوت دراصل کارِ نبوت ہے اور اس کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ داعی حق فہم و فراست کامل ایمان و یقین اور تعلق باللہ رکھنے والا ہو، یہ داعی کے مقومات ہیں اور اس کی دعوت کی ناگزیر ضروریات ہیں اگر داعی حق میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں، تو اس کی دعوت بے اثر رہے گی اور کسی خوبی سے ان اوصاف کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ داعی کو چاہیئے کہ وہ ان اوصاف پر نظر رکھے اور ان کی کمی اور خامی کو دور کرتا رہے، اب ان اوصاف کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عمل سے پہلے علم کی ضرورت

علم عمل پر مقدم ہے چنانچہ اس فرمان میں اللہ جل شانہ نے علم کو عمل پر مقدم رکھا ہے

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (محمد : ۱۹)

(پس اے نبی خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور معافی مانگو اپنے قصور کے لئے)

ظاہر ہے کہ علم اس لئے بھی مقدم ہے کہ عامل (عمل کرنے والے) کو پہلے سے خبر ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے اور بالخصوص داعی کے لئے تو بہت زیادہ ضروری ہے کہ اس کے کام کا تعلق دین سے ہے، اس لئے اس کو اپنے کارِ دعوت کا پورا علم اور واقفیت اور بصیرت حاصل ہونی چاہیئے۔

جاہل اگر کارِ دعوت انجام دے گا تو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا اور اصلاح کے بجائے خرابی پیدا ہوگی کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر ان امور کو حکم الٰہی بنا کر پیش کرے گا جو درحقیقت حکم الٰہی نہیں ہوں گے اور معروف کی اشاعت میں رکاوٹ بن جائے گا۔

غرض داعی کی اولین ضرورت یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز سے بخوبی واقف ہو اُسے یہ بخوبی معلوم ہو کہ کن امور میں اجتہاد درست ہے اور جن امور میں اجتہاد درست نہیں ہے نیز یہ کہ ہر امر شرعی کے مختلف پہلو کیا ہیں۔

علم وہ ہے جس کے علم ہونے پر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ سے دلیل موجود ہو یہی علم شریعت کارِ دعوت میں مفید ہے اور داعی پر لازم ہے کہ وہ اس علم شرعی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے اور شریعت کے اوامر اور نواہی کا پورا پورا ادراک حاصل کرے۔

علم کی فضیلت

قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں متعدد مقامات پر علم اور اہل علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور زیادہ سے زیادہ حصول علم کی تاکید کی گئی ہے چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ : ۱۱۴)

(اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر)

اور فرمایا۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ : ۱۱)

("تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور جن کو علم بخشا گیا ہے۔ اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔")

اور سنت نبویؐ میں ہے کہ

جس شخص سے اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے علم دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔

اس سے بڑھ کر علم کی فضیلت اور کیا ہوگی کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنی توحید پر اہل علم کی گواہی کو بیان کیا ہے اور اس گواہی کو اپنی اور فرشتوں کی شہادت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ اہل علم کی توثیق، تائید اور ان کی گواہی کو بہت اہم اور بلند درجہ عطا کرتا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (آل عمران : ۱۸)

("اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں۔")

اہل علم کے علم کا فائدہ خود اُن کو بھی پہنچتا ہے اور لوگوں کو بھی یہ نفع عام حاصل ہوتا ہے کہ ان کے علم کے ذریعے لوگ اپنے رب تک پہنچتے ہیں اور اُسے جانتے اور پہچانتے ہیں اسی لئے حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ علم کی احتیاج کھانے پینے کی احتیاج سے زیادہ ہے اس لئے کہ کھانا دن میں دو وقت درکار ہوتا ہے جبکہ علم کی ہر سانس پر ضرورت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ طلب علم نفل نماز سے بڑھ کر ہے اور اسی طرح کے اقوال حضرت امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ سے مروی ہے اور سنت نبویؐ میں یہ بشارت موجود ہے کہ آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات عالم دین کے حق میں استغفار کرتی رہتی ہیں اور اللہ سبحانہٗ اور فرشتے لوگوں کو خیر سکھلانے والوں پر رحمتیں نازل کرتے رہتے ہیں۔[1]

اس لئے داعی حق کو چاہئے کہ وہ علماء کے ساتھ رہے اور ان سے علم دین حاصل کرے۔

شعور کامل

علم میں بھی سب سے وسیع اور سب سے زیادہ ضروری علم، علم آخرت ہے کہ اس سے لوگوں کے دل پگھلتے اور آمادہ عمل ہوتے ہیں اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں اس کی زندگی ایک مسافر کی زندگی ہے اور یہ دنیا کی زندگی بے حد مختصر ہے اور آخرت کا طویل سفر درپیش ہے جس کے لئے تقویٰ کا

[1]: ابن القیمؒ : مدارج السالکین، ج ۱، ص ۴۵۲ -

زاد راہ ناگزیر ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرہ : ۱۹۷)

("اور زاد راہ ساتھ لے جاؤ۔ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے")

اسی علم آخرت سے انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا کیا انجام ہونے والا ہے، کیا وہ جہنم کی طرف کشاں کشاں کھنچا چلا جا رہا ہے یا اس کی سعادت اسے راہِ جنت پر گامزن کئے ہوئے ہے۔ اس خوف و رجاء کی کیفیت میں وہ قدم بڑھاتا ہے مگر اس کا یہ خوف ایک جاہل کا خوف نہیں ہوتا بلکہ ایک عارف اور عامل کا خوف ہوتا ہے۔ مگر یہی وہ علم ہے جس کی شدید کمی ہے اور جس کا طلبۂ علم میں فقدان ہے حالانکہ اس کے بغیر کسی عالم کو عالم ہی متصور نہ کیا جانا چاہیئے۔ خواہ اسے کتنی ہی کتابیں ازبر ہوں۔ کیونکہ علم کا اصل مغز اور اس کی اصل روح تو ایسا علم آخرت ہے جس سے تقوی اور روحانیت پیدا ہو اور جس کی داعی کو بہت زیادہ ضرورت ہے اور اسی علم کو ہم نے فہم جنزرس کہا ہے۔ صحابہ کرام کے دلوں میں یہی علم رچا بسا تھا، وہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرنے دیتے تھے جس میں اطاعتِ الٰہی نہ ہو بلکہ وہ ہر دم اطاعت الٰہی، اس کی راہ میں جہاد اور اس کی رضا کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔

شعور کامل مفاہیم قرآن پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

جو شخص قرآن کے مفاہیم پر غور کرے اس کے مطالب پر تدبر کرے اور اس کے مقاصد کو مد نظر رکھے اسے یہ شعور کامل اور یہ ادراک اور بصیرت حاصل ہوتی ہے اور اسے قرآن کا حقیقی فہم حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن اسی لئے نازل ہوا ہے کہ اس پر غور و فکر اور تدبر کیا جائے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (صٓ: ۲۹)

("یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے۔ جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ تاکہ اس کی آیات پر غور کریں۔ اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق حاصل کریں۔")

نیز فرمایا کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد : ۲۴)

(کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا۔ یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں)

قرآن کریم کا غور اور تدبر کے ساتھ مطالعہ کرنے ہی سے رب حقیقی تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال داعی کے لئے ضروری ہے کہ اسے صحیح فہم و ادراک حاصل ہو کہ کون سا راستہ رضائے الٰہی کا ہے اور کون سا راستہ شیطان کا راستہ ہے اور کیا بات حق ہے اور کیا باطل ہے کون سا امر ہدایت ہے اور کون سا گمراہی ہے اور کون سی بات سرکشی ہے اور کون سی رشد و ہدایت ہے۔

داعی کے لئے لازمی ہے کہ اسے صحیح تصور آخرت ہو اور وہ دعوت کا کام پورے ذوق و شوق، جانفشانی اور محنت اور دنیا سے بے تعلقی کے ساتھ انجام دے اور اس کی یہ کیفیات محسوس اور متاثر کن ہوں [1]

حسن فہم کے ارکان

دعوت کے کام کو بخوبی اور گہرائی تک سمجھنے کے کئی پہلو ہیں، لیکن ان میں دو بہت اہم ہیں۔

۱۔ داعی مقصد حیات کو خوب سمجھتا ہو اور اپنے مقصد کا پورا علم ہو اور اس مقصد کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہے اس کا پورا ادراک ہو۔

۲۔ دُنیا کی دلچسپیوں سے دور رہے اور آخرت سے قلبی تعلق قائم رہے۔

---

[1] : ابن القیمؒ : مدارج السالکین ج ۱، ص ۴۵۲۔

مقصد حیات

انسان کا مقصد وجود کیا ہے اور کس مقصد کی انجام دہی کے لئے اسے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے قرآن کریم اس سوال کا جواب دیتا ہے اس میں انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔

ایک گروہ وُہ ہے جن کا مقصد کھانا پینا اور جسمانی لذتوں کی تکمیل ہے اور وہ اپنی زندگی کے لمحات حصول لذات ہی میں صرف کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد فنا زوال اور عدم ہے اور یہ لوگ بد ترین مخلوق اور شقی ترین انسان ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّہُمْ۔

(محمد : ۱۲)

(اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اُن کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے۔)

یہ لوگ جانوروں اور بہائم کی طرح ہیں اور ان سے ماسوا شکل و صورت کے کسی اور بات میں مختلف نہیں ہیں۔ اور یہ لوگوں میں گمراہی کو فروغ دیتے رہتے ہیں اور فساد پھیلاتے رہتے ہیں اور بالآخر انہیں جہنم رسید ہوجاتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ بِاِذْنِہٖ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (البقرہ : ۲۲۱)

(اور یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ اپنے اذن سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے)

دوسرا گروہ وہ ہے جسے حقیقت کا ادراک اور مقصد زندگی کا عرفان حاصل ہے اور انہیں علم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کے پاس سے آئے ہیں

اور اسی کے پاس لوٹ کر جاتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ (الذاریات : ۵۶)

("میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں")

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (الانشقاق : ۶)

(اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جارہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے)

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف عبادتِ الٰہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اس لئے دنیا میں آئے ہیں کہ راہِ حق میں جہاد کریں اور لوگوں کو دعوتِ حق دیں اور زمین کو فعل خیر سے آباد کریں اور بھٹکے ہوؤں کو حق کی ہدایت کریں یہی مقصود حیات ہے اور یہی مطلوب زندگانی ہے اور اس تمام عمل سے مقصود محض رضائے الٰہی ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ. (الحج : ۷۷، ۷۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ رکوع اور سجدہ کرو۔ اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے۔ اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا۔ اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ وہ ہے تمہارا مولا۔ بہت ہی اچھا ہے وہ مولا اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔)

اس آیت میں مسلم کی زندگی کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صرف عبادت اور جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہے اور جہاد نفس کرتا رہے کہ اپنے نفس کو برائیوں سے روکے اور اعمال خیر پر آمادہ کرے اور اپنے قلم اور اپنی جان اور مال سے جہاد کرے تاکہ کلمۂ الٰہی بلند ہو اور انسان نور اسلام سے منور ہو۔

مسلمانوں کو اللہ سبحانہ نے اس اہم فریضہ کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے کام کو انجام دیں، ان کی حق کی جانب راہنمائی کریں اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ یہ ایسا فریضہ ہے جس سے پہلوتہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ رضا اور شکر الٰہی کے ساتھ اس کام کو انجام دیں۔

دنیا سے بے نیازی اور آخرت سے تعلق

اس سے بڑا قلب ونظر کا اور کوئی فساد نہیں ہے کہ مسلمان دنیا سے دل لگالے اور آخرت کو بھلادے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگے، آخرت کے لئے عمل سے گریز کرے اور دعوت الی اللہ کے کام سے گرانی محسوس کرے۔ بلاشبہ دنیا کی لذتوں میں بڑی دلکشی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

ان الدنیا حلوۃ خضرۃ وان اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون فاتقوا الدنیا واتقوا النساء۔

(دنیا بڑی شیریں اور سرسبز ہے اور اللہ سبحانہ نے تمہیں یہاں اسلئے بھیجا ہے کہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو، اس لئے اے لوگو دنیا سے اور عورتوں سے بچو)

اور خود سبحانہ نے ہمیں دنیا کے کانٹوں میں الجھنے سے منع فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ (فاطر: ۵)

(لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے۔ لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے)

دنیا میں بڑے کیف و سرور اور بڑی لذتیں اور دلکشیاں موجود ہیں جن پر انسان مائل ہو جاتا ہے اور آخرت کو فراموش کر دیتا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (القیامۃ: ۲۰، ۲۱)

(ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو)

اگر اس چراگاہ میں نفس کو بلا روک ٹوک چھوڑ دیا جائے تو نفس اسی دلکشی میں گھر کر ہر امر سے غافل ہو جائے گا اور یہی تلذذ اور کیف و سرور اس کا مطمح نظر بن جائے گا

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ (النجم ۲۹-۳۰)

(جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے۔ اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے)

جب نفس تلذذ حیات میں اس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی کوئی وعظ و نصیحت اس پر اثر نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص دعوت الی اللہ کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔

قلب کو دنیا کی ان آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ یقین پیدا ہو کہ دنیا اور دنیا کی نعمتیں ختم ہو جانے والی اور فنا ہو جانے والی ہیں اور موت یقینی ہے اور یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد دار آخرت پہنچنا ہے اور یہ کہ دنیا ترجیح دینے کے قابل نہیں ہے بلکہ لازم ہے کہ مسلمان آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (القصص : ۶۰)

(تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے۔ وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا

(النسآء : ۷۷)

("ان سے کہو دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے۔ اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔")

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل : ۹۶)

("جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے")

صرف یہی یقین کافی نہیں ہے کہ دنیا فانی اور آخرت کی زندگی دائمی زندگی ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان دنیا کی امیدوں اور یہاں کے فوائد کے حصول کی توقعات کم کرے، تمنائیں گھٹائے اور آسائش دنیا کی خواہش کو دبائے اور دنیا میں اس طرح رہنا سیکھے جس طرح ایک مسافر درخت سایہ دار کے نیچے کچھ وقت کے لئے ٹھہر جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب صبح ہو جائے تو اپنے دل میں شام کی فکریں داخل نہ کرو اور جب شام ہو جائے تو اپنے دل میں صبح کے افکار نہ بھرو اور آپؐ نے فرمایا کہ۔ مجھے دنیا سے کیا تعلق، میری تو یہاں بس ایسی حیثیت ہے جیسے کوئی مسافر درخت سایہ دار کے نیچے کچھ دیر ٹھہرے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جائے

اگر کوئی شخص نوجوان اور صحت مند ہو اور اسے خیال ہو کہ صحت بھی ہے اور جوانی بھی اور عمر ابھی باقی ہے ڈھلتی عمر میں خدا کی اطاعت بھی کر لیں گے، تو یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور اسے فوراً دل سے نکال دینا چاہیئے، اُسے چاہیئے کہ قبرستان جائے اور فکر آخرت تازہ کرے اور یہ دیکھے کہ کتنے نوجوان ہیں جو اس

بستی میں سوئے ہوئے ہیں اور پھر اپنے محلے میں آکر بوڑھوں اور ضعیف العمر لوگوں کا شمار کرے، جو اسے تقریباً دس فیصد ملیں گے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اکثریت کی موت نوجوانی ہی میں اور پیرانہ سالی سے پہلے ہی واقع ہو جاتی ہے۔

دنیا کی زندگی کی امیدیں اور آرزوئیں گھٹا کر آدمی اطاعت اور عمل کی جانب راغب ہو اور آخرت کی تیاری کرے اور اس طرح تیاری کرے کہ نہ معلوم کس وقت بلاوا آجائے۔

داعیِ حق تعلق دنیا سے آزاد ہو جائے اور اس کا قلب اس گھٹن سے نجات حاصل کرلے اور آخرت کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے تو اس کی روح ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور دعوتِ حق کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، اور کوئی زحمت، دشواری، سفر، تکلیف، مشقت اور قربانی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ یہی تعب و مشقت عین راحت بن جاتی ہے، اس راہ کی تکالیف میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے، اور اسی قربانی میں اس کا صلہ نظر آنے لگتا ہے۔

یہ کوئی تصوراتی بات نہیں ہے بلکہ ایک عملی حقیقت ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جو ایک طویل عرصے سے اپنے گھر سے اور اپنے اعزہ سے دور ہو، اور اب ان کی ملاقات کے لئے جا رہا ہو تو سفر کی تیاریاں اور راہ کی صعوبتیں اسے محسوس نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان میں بھی ایک کیف اور سرور محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا ادراک تجربہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

(۲)

ایمان عمیق

حقیقت ایمان عمیق

ایمان عمیق سے ہماری مراد یہ ہے کہ داعیٔ حق کو یقین کامل ہو کہ جس اسلام کی اللہ نے اسے ہدایت دی ہے اور جس کی دعوت عام کرنے کا اسے حکم دیا گیا ہے وہ خالص حق ہے اور یہ اللہ سبحانہٗ کی نازل کردہ سچی ہدایت ہے اور اسلام کے ماسوا ہر کلمہ اور ہر بات ضلالت اور گمراہی ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (الانعام : ۷۱)

(کہو! حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے)

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس : ۳۲)

("پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی ہے")

اس حقیقت پر داعیٔ حق کو اس قدر کامل یقین ہو جس طرح کہ محسوسات اور بدیہیات پر یقین ہوا کرتا ہے کہ اس حقیقت کے بارے میں وہ کسی بحث، کسی تنقیح کسی مناظرہ اور کسی گفتگو پر توجہ نہ دے کہ اس حقیقت سے سرمو انحراف بھی گمراہی اور ایمان کا ضیاع ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔ (الانعام : ۵۶)

("اے نبیؐ ان سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہو اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا وہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔

اسلام کی حقانیت پر اس ایمان کی اساس علم قطعی اور برہان مبین ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اگرچہ بصیرت کے اندھے اور مردہ دل گمراہ لوگ جن کو اللہ کی نازل کردہ اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے وہ اسے جھٹلاتے اور اس کی تکذیب کرتے ہیں، اس لئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ داعی حق ان کی اس تکذیب سے متاثر ہوگا کیونکہ کسی بینا شخص کے اندھوں میں پہنچ جانے سے خود اس کی بینائی متاثر نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر صاحب بصیرت داعی کو بصیرت حق سے بے بہرہ افراد سے واسطہ پڑے تو اس کے ایقان میں کمی نہیں آتی۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ۔ (الانعام : ۵۷)

"(کہو میں اپنے رب کی دلیل روشن پر ہوں۔ اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اختیار وہ چیز نہیں ہے۔ جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو۔ فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے۔ امر حق بیان کرتا ہے۔ اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔)

داعی حق کا یہ ایمان عمیق براہ راست اسلام کی طبیعت اور اس کے مزاج سے مستفاد ہے، اسی ایمان سے اس کا وجود متحرک رہتا ہے اور یہی روح ایمان اس کے جسم میں حرارت بن کر دوڑتی ہے اور کسی بیرونی اثر اور خارجی سبب سے نہ اس کے ایمان میں کوئی کمزوری آتی ہے اور نہ کوئی ضعف پیدا ہوتا ہے۔

داعی حق ان لوگوں میں سے نہیں ہوتا جن کے بارے میں اللہ تعالے نے فرمایا ہے کہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ۔ (الحج : ۱۱)

("اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے۔ جو کنارے پر بیٹھ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہوا

تو مطمئن ہوگیا۔ اور جو مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔)

یہ کیفیت منافق اور ضعیف الایمان شخص کی بیان کی گئی ہے، جیساکہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے فرمایا کہ منافق کی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کی دنیا درست ہے تو اس کی عبادت بھی قائم ہے اور اگر اس کی دنیا درست نہ رہے تو اس کی عبادت سے طبیعت اچاٹ ہو جائے گی ماسوا اس عبادت کے جس سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہو اور اگر ذرا تنگی سختی، شدت اور امتحان آگیا فوراً دین کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا۔[1]

داعی حق کا سچا اور گہرا ایمان کسی امتحان، اور آزمائش سے متزلزل نہیں ہوتا اور داعی کی قوت اور مسائل کی کمی اور مخالفین کی طاقت و شوکت اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کرتی اور اس بارے میں کوئی شک و شبہ پیدا نہیں ہو کہ وہی حق پر ہے اور کافر گمراہی میں مبتلا ہیں، اگرچہ وہ تنہا کیوں نہ ہو، صحابۂ کرامؓ نے ہر مرحلہ پر اسی استقامت کا ثبوت دیا ہے، خواہ وہ مرحلہ مکی زندگی پر مصائب زندگی کا مرحلہ ہو، یا ہجرت حبشہ کا مرحلہ ہو، فتح بدر ہو، ہزیمت احد ہو، محاصرہ خندق ہو، ہر مرحلہ اور ہر مقام پر وہ ثابت قدم رہے کہیں ان کے ایمان میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا اور انہیں کبھی اس بارے میں شبہہ نہیں ہوا کہ وہ حق پر ہیں اور تمام کفار عرب گمراہی میں مبتلا ہیں۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۔ (الرعد : ۱۴)

(اسی کا پکارنا برحق ہے رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے

---

[1] : تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۰۹

ہیں وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف سوال کرے۔ کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اس طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں مگر ایک تیر بے ہدف۔)

اگر لوگ دعوت حق قبول نہ کریں تو اس سے داعی کے ایمان میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ حضرت نوحؑ کے ایک طویل عرصہ تک دعوت حق دیتے رہنے کے باوجود چند ہی افراد ایمان لائے تھے۔

فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (العنکبوت:۱۴)

("وہ پچاس کم ایک ہزار برس اُن کے درمیان رہے۔")

اسی طرح لوگوں کا دعوت حق قبول نہ کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ اس کی دعوت میں کوتاہی ہے بشرطیکہ داعی نے اپنی طرف سے پوری سعی کی ہو، یعنی داعی کی طرف سے کوتاہی کا تعلق اس امر سے ہے کہ وہ دعوت کے پہنچانے کی ضروری جدوجہد نہ کرے، اس سے نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت قبول نہ کریں۔

داعی مسلم کو اس ایمان کی ضرورت

اس طرح کا پکا سچا ایمان داعی کے لئے انتہائی ضروری ہے بالخصوص آج کے زمانے میں جبکہ کلمۂ اسلام ضعیف و کمزور اور کلمۂ کفر بلند اور طاقتور ہے اور اہل اسلام کے دلوں میں ایمان کی قوت موجود نہیں ہے اور مسلمانوں پر آزمائشوں کے دل بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کافروں پر مسلط ہیں اور کفر کے اختیار کرنے والوں کے پاس عظیم سلطنتیں بڑی قوتیں اور طاقتیں ہیں جن کے زور پر وہ باطل کی اشاعت اور شکوک و شبہات کے پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں میں ایسے علماء سوء اور ایسے جھوٹے داعی موجود ہیں

جو دنیا کے بدلے دین کو فروخت کرتے ہیں زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں اور دلوں میں دنیا کی خواہشیں رکھتے ہیں اور نفوس میں گمراہی چھپائے ہوئے ہیں۔

اس کے باوجود سچے مسلمان داعی حق کو ان آزمائشوں سے دل تنگ نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ حالات اس کے لئے مہمیز بننا چاہئیں اور اسے دین کا کلمہ بلند کرنے کے لئے زیادہ جدوجہد کرنی چاہیے اور ان مصائب کا علاج دریافت کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ مسلمان حیرت اور استعجاب کی نگاہوں سے اس عظیم گمراہی کو دیکھتے رہیں اور اس کی اصلاح کی سعی نہ کریں۔

مسلمان داعی کے ذہن میں وہ روایت ہونی چاہیے، جو بخاریؒ اور مسلمؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دجال کے بارے میں حدیث بیان کر رہے تھے اس میں آپؐ نے فرمایا کہ

'دجال آئے گا اور اسے مدینہ کی گلیوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی البتہ وہ مدینہ سے ملحق دلدلی زمین میں آئے گا، ایک شخص اس کے پاس جائے گا جو کہ بہت اچھا شخص ہوگا وہ اس سے کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو دجال ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حدیث بیان کی ہے اس پر دجال کہے گا، تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اس شخص کو قتل کر کے زندہ کر دوں، کیا تم پھر بھی شک کروگے لوگوں نے کہا نہیں، وہ اسے قتل کر کے زندہ کر دے گا۔ لیکن یہ (مؤمن) شخص کہے گا کہ اب تو تیرے بارے میں اور بھی یقین ہو گیا (کہ تو دجال ہے) اس پر دجال اسے دوبارہ قتل کرنا چاہے گا مگر نہیں کر سکے گا۔ [۱]

اس حدیث سے بڑے مفید نتائج اخذ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ دجال جب الوہیت کا اور اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کرے گا کئی خرق عادت مظاہروں کی بنا پر لوگوں کی ایک بڑی اکثریت اس کی متبع ہو جائے گی، اور وہ لوگوں کے سامنے ایک

---

۱ : صحیح بخاری، صحیح مسلم۔

شخص کو قتل کر کے اسے زندہ کردے گا، زمین کو پیداوار کا حکم دے گا اور زمین سے افزائش ہو جائے گی اور پانی کو حکم دے گا اور وہ برسنے لگے گا۔ مگر ان حالات میں بھی سچے مومن کو اس کے دجال ہونے پر کوئی شبہہ نہیں ہوگا اور وہ بدستور اسلام پر قائم رہے گا کیونکہ وہ سمجھتا ہوگا کہ دجال کے دعوے مفاہیم اسلام کے خلاف ہیں اس لئے باطل ہیں اور باطل کسی بھی صورت میں اور کسی بھی حالت میں حق نہیں بن سکتا، خواہ اس کے لئے کتنے ہی خوارق عادت امور کا مظاہرہ کیا جائے۔ اسی طرح اسلام جو کہ حق ہے اس وجہ سے باطل قرار نہیں پا سکتا کہ باطل پرستوں کی ایک بڑی جمعیت میں مؤمن ایک ہی ہے، بلکہ جب دجال اس مومن کو قتل کر کے زندہ کرے گا تو اس سے اس کے ایمان میں اور اضافہ ہوگا اور اس کے اس یقین میں اضافہ ہوگا کہ دجال فی الواقع کذاب ہے اور اس کے خوارق عادت امور سے فرمان نبوت ؐ کی تصدیق ہوتی ہے، بہر حال یہ مسلمان اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے گا، حالانکہ اس کے پاس کوئی مادی قوت وطاقت موجود نہیں ہوگی۔

اس ایمان کے ثمرات اور اس کے لوازم

اس ایمان کامل اور اس اسلام کامل کے کچھ نتائج اور ثمرات ہیں جن کا ظاہر ہونا لازمی ہے اور اگر یہ نتائج اور یہ ثمرات مرتب نہ ہوں تو یہ اس ایمان کی کمزوری اور اس کے ضعف کی دلیل ہیں۔

کتاب اللہ اور سنت نبوی ؐ میں جہاں مومنین کی صفات بیان ہوئی ہیں وہیں یہ نتائج اور ثمرات بھی بیان ہوئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان آیات اور احادیث کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے مفاہیم پر غور کیا جائے، لبعد ازاں یہ جائزہ لیا جائے کہ یہ مفاہیم کس حد تک موجود ہیں اور یہ صفات مطلوبہ کس حد تک پائی جاتی ہیں، اگر یہ صفات ایمانیہ موجود ہیں، تو اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر نہیں ہیں یا کمزور ہیں تو اپنے ایمان

کا تدارک کرے اور اس کو قوی کرنے کی سعی کرے اور ایمانی غذا کے حصول کی سعی کرے انشاء اللہ مطلوب ضرور حاصل ہوگا اور ایمان کا اثر گہرا ہو جائے گا۔

یہاں پر ہم ایمان کے بعض اثرات اور بعض فوائد کا ذکر کرتے ہیں۔

اوّل: محبت خداوندی

بندہ کا اپنے رب سے تعلق قائم رکھنا اور عشق الٰہی میں ڈوبے رہنا ایمان کی علامت اور اس کا ثمرہ ہے چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ۔ (المائدہ: ۵۴)

("جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کا محبوب ہوگا"۔

عشق الٰہی اور حُبِ خداوندی ہی اصل روحِ ایمان اور اس کا حقیقی ثمرہ ہے کیونکہ ایمان کا تعلق یقینی معرفت سے ہے اور حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ جس کو رب کا عرفان حاصل ہوگیا اسے رب محبوب ہوگیا اور جس قدر معرفت قوی ہوگی ایمان کی گہرائی اور عمق میں اضافہ ہوگا۔

قوتِ عرفان صفات الٰہی میں تفکر سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی نعمتوں میں غور سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی سب سے بڑی نعمت دولت ایمان ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ۔ (الاعراف: ۴۳)

(اور وہ کہیں گے کہ تعریف خدا کے لئے ہے۔ جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا۔)

حُبِّ الٰہی کا مقتضا یہ ہے کہ وہ امور محبوب ہوں جو حق جل جلالہٗ کو محبوب اور پسندیدہ ہیں اور اسی حُبِّ الٰہی کی بنا پر مومن اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

محبت کرتا ہے اس لئے کہ آپؐ کی ذات ستودہ صفات ہے اور آپؐ اللہ کے حبیب ہیں اور آپؐ بنی نوع انسان کو ہدایت الٰہی اسلام پہنچانے والے ہیں۔

مؤمن قرآن سے بھی محبت رکھتا ہے اس لئے کہ قرآن پیغام خداوندی اور کلام الٰہی ہے۔ نیز مومن دیگر مومنین سے محبت رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے اور اس کے مطیع ہیں۔

حُبِّ الٰہی مومن کے نفس پر اثر انداز ہوتی ہے اور مؤمن اس کی حلاوت اور شیرینی محسوس کرتا ہے چنانچہ فرمان نبوت ہے۔

ثلاثة من کن فیه وجد حلاوة الایمان ان یکون اللہ ورسوله احب الیه مما سواهما وان یکره ان یرجع الی الکفر بعد ان انقذه اللہ منه کما یکره ان یقذف فی النار وان یحب المرء لا یحبه الا للہ

"جس میں تین صفات ہوں وہ حلاوت ایمان پائے گا جس کے لئے اللہ اور رسول ان کے ماسوا ہر شے سے زیادہ محبوب ہوں، جس کے لئے کفر کی جانب پلٹنا آگ میں پھینک دیئے جانے سے زیادہ ناگوار ہو اور جو کسی شخص سے محض ذات الٰہی کی رضا کے لئے محبت رکھتا ہو۔"

اپنے رب سے۔ بندہ کی یہ محبت ان تمام امور کو لازم ہے اور یہ فوائد اس محبت کا ضروری ثمرہ ہیں اب ہم ان کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

بندہ کے اپنے رب سے محبت کے لوازم

اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدہ: ۵۴)

(" اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے۔ تو اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کردے گا۔ جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔ جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے")

نیز فرمایا کہ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران : ۳۱)

("اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا")

ان دونوں آیات کی روشنی میں محبت رب کے یہ لوازم معلوم ہوئے۔

۱۔ مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بڑا رحم دل بڑا شفیق اور بڑا مہربان ہوتا ہے، وہ اپنے مسلمان بھائی کو رضائے الٰہی کے کاموں کی دعوت دیتا ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جو صحابۂ رسولؐ کے بارے میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ رحماء بینھم

۲۔ مسلمان کافروں پر سخت ہوتے ہیں جیسا کہ صحابۂ کرام کے بارے میں بیان ہوا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔

(محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں)

یعنی مسلمان کافروں کے سامنے بے کس، لاچار، اور مجبور نہیں ہوتا بلکہ اس کی ایمانی قوت اسے غالب رکھتی ہے۔

۳۔ مسلمان اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ہمیشہ جہاد نفس میں لگے رہتے ہیں تاکہ نفس کو اطاعت الٰہی اور دشمن سے مقابلہ پر استقامت اور ثبات حاصل ہو اور دعوت الٰہی کی جدوجہد میں قوت حاصل ہو اور ہر طرف سے توجہ منقطع کر کے دعوتِ الٰہی میں لگ جائے اور اسی کے بارے میں غور و فکر کرے اور جملہ وسائل و ذرائع کو اسی دعوتی کام کی کامیابی میں کھپائے اور جان و مال اور وقت و آرام کو اسی مقصد عظیم میں صرف کرے۔

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ن اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

(التوبہ: ۲۴)

(اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں۔ اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے۔ اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں۔ تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں۔ تو انتظار کرو کہ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

۴۔ مسلم کسی کے ملامت کرنے اور برا بھلا کہنے سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور کوئی بات اسے اطاعت الٰہی، دعوتِ حق۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے باز نہیں رکھ سکتی۔

۵۔ رسول کریمؐ کی تمام حالات اور جملہ کیفیات میں مکمل اتباع اور پیروی اور ان تمام امور سے اجتناب جن سے آپ نے منع فرمایا ہو۔

وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (الحشر: ۷)

(جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو۔ اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے اس سے رک جاؤ)

کہ ذات نبوتؐ ہی داعی حق کے لئے نمونۂ ہدایت ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

("درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا")

داعی حق کے لئے سب سے مفید امر یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کے ہر مرحلے میں سنت

رسولؐ اور سیرت کی اتباع اور پیروی کرے کہ آپؐ کی حیات طیبہ منہاج الٰہی کی مکمل عملی تعبیر اور آیات قرآنی کی عملی تفسیر ہے۔ داعی کی دعوت کے ہر مرحلے پہ سیرت نبویؐ سے اسوہ حسنہ ملتا ہے اور اس پہ لازم ہے کہ وہ ہر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کرے۔

سیرت نبویؐ کے فہم کے ساتھ فہم قرآن بھی ضروری ہے، بالخصوص ان امور میں جو دعوت سے متعلق ہوں تاکہ تمام چھوٹے بڑے امور میں داعی سیرت رسولؐ کا اور فرقان مبین کے نور کا متبع رہے۔

سیرت نبویؐ کی اتباع اور پیروی میں اس وقت سہولت ہوتی ہے جب داعی کے ذہن میں حضور نبی کریمؐ کی شخصیت مستحضر ہو اور ان سے آپؐ کی روحانی اور وجدانی مصاحبت حاصل ہو اور ذہن میں آپؐ جملہ صفاتِ کریمہ موجود ہوں اور آپؐ کی امت پر شفقت کا صحیح تصور ہو۔ اس استحضار سے آپؐ کی محبت میں اضافہ ہوگا اور جس قدر حب رسولؐ میں اضافہ ہوگا اسی قدر آپؐ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان داعی حق کے اپنے رب سے محبت کرنے کے اور بھی متعدد فوائد ہیں۔

۱۔ داعی حق ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اور کبھی اس کی زبان نہیں تھکتی اور اس کے قلب میں اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ جو شخص جس شے سے تعلق محبت رکھتا ہے اسی کا ذکر کثرت سے کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حق سبحانہٗ کی محبت کرنے والوں کی ایک علامت کثرت سے کلام پاک کی تلاوت کرنا ہے، کہ قرآن سے ان کا قلب معمور رہتا ہے، وہ ان کی تنہائیوں میں ان کا رفیق ہوتا ہے اور اس کے نور سے ان کا سینہ منور رہتا ہے اور اسی لئے داعی حق کو ان اذکار میں مشغول رہنا چاہیئے جو سنت میں وارد ہیں اور اسے چاہیئے کہ صبح کی نماز کے بعد سونے کے وقت آمد و رفت کے وقت کھانے پینے کے اوقات میں اور سفر و اقامت میں ہر موقع پہ ان کا ورد رکھے۔

(ب) خلوت میں اللہ سبحانہٗ کی مناجات سے مانوس رہے گا اور متوحش اور تنگ نہیں ہوگا۔

(ج) طاعت الٰہی سے لطف اندوز ہوگا، اسے بھاری نہیں محسوس کرے گا کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کی خدمت سے لطف حاصل کرتا اور اس سے خوش ہوتا ہے اسی لئے سرکار دو عالمؐ نے نماز کو آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کا سرور قرار دیا ہے اور حضرت جنیدؒ نے فرمایا ہے کہ عاشق الٰہی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر دم طاعت الٰہی میں لگا رہتا ہے اور اس سے سرور حاصل کرتا ہے۔

(د) جو کچھ فوت ہو جاتا ہے اس پر اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا اور وہ ہر ساعت ذکر الٰہی اور اطاعت میں مصروف رہتا ہے۔

(ھ) ان امور کو جن کو اللہ پسند فرماتا ہے ان باتوں پر ترجیح دیتا ہے جنہیں وہ خود پسند کرتا ہے کہ محبِ صادق ہمیشہ ان امور کو ترجیح دیتا ہے جو اس کے محبوب کو پسند ہوں اور کسی مشقت اور تعب کی پرواہ نہیں کرتا۔

(ن) اللہ کی ملاقات محبوب رکھتا ہے جس طرح کہ ہر حبیب اپنے محبوب سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور اسی وجہ سے اسے موت ناگوار نہیں رہتی بلکہ وہ اس کے حق میں حق سبحانہٗ سے ملاقات کا ذریعہ ہوتی ہے۔

(ح) اسے اللہ سبحانہٗ کے لئے غیرت ہوتی ہے اور جب محارم خداوندی پامال ہوں تو اسے ناگواری ہوتی ہے اور غصہ آتا ہے ہمارے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لئے کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ آپؐ کو جب بھی غصہ آتا اللہ کے حکم کو توڑنے پر آتا اسی غیرت کی بنا پر وہ اگر دیکھتا ہے کہ مسلمان احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو اسے رنج اور افسوس ہوتا ہے، چنانچہ مروی ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ ایک مرتبہ آبدیدہ گھر میں داخل ہوئے گھر والوں نے آپؓ سے پوچھا کہ کیا بات ہے آپ کیوں رو رہے ہیں

فرمانے لگے میں مسجد گیا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ اب لوگ اس طرح نماز قائم نہیں کرتے جس طرح عہد نبوتؐ میں نماز قائم ہوتی تھی۔

دوم: خشیت الٰہی

اس ایمان کا ایک لازمہ خشیت الٰہی بھی ہے کہ حکمت کی اساس اللہ کا خوف ہے جو اللہ کو پہچان لے گا وہ اللہ سے ڈرے گا اور جو اللہ سے ڈرے وہ دنیا میں لوگوں سے نہیں ڈرے گا۔

خوف کی حقیقت یہ ہے کہ قلب کو مستقبل میں پیش آنے والے کسی واقعے سے تکلیف محسوس ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ خشیت الٰہی سے مراد ایک مسلمان کا یہ علم ہے کہ آخرت میں خدا ان برے کاموں کی یہ سزا دے گا۔ جس قدر مؤمن کا یہ احساس بڑھتا جائے گا، اللہ سبحانہٗ کے احکام کی خلاف ورزی بہت بڑا گناہ ہے اور اس قدر بڑی برائی ہے کہ اگر خدا ساری مخلوق کو ہلاک کر دے تو کوئی امر مانع نہ ہو، اسی قدر اس کی خشیت اور خوف میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

قرآن کریم کی وعید پر مشتمل آیات کے مطالعہ اور ان میں تدبر سے بھی خشیت الٰہی میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ یہ آیات حق اور صدق ہیں اور ان میں کوئی مبالغہ اور خیال آفرینی نہیں ہے بلکہ آیات قرآنی اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہر شخص کے تمام اچھے برے اعمال پر جزا و سزا دی جائے گی۔

غرض ایمان عمیق گناہوں کے احساس اور وقت حساب کے شعور سے خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے اور اس احساس سے خوف خدا پیدا ہوتا ہے کہ انجام نامعلوم سامنے ہے اور حکمرانی اور حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اس طرح مسلمان ان برائیوں سے بچتا ہے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

خشیت الٰہی اور خوف خداوندی کے اثرات جسم پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور مومن غمگین و حزین اور افسردہ رہتا ہے وہ مذاق اور یاوہ گوئی نہیں کرتا وہ ہنستا ہے تو اس کی ہنسی صرف تبسم ہوتی ہے کیونکہ جو شخص خطروں میں گھرا ہوا ہو، اندیشے اسے دامنگیر ہوں اور خوف اس پر چھایا ہوا ہو وہ کہاں ہنس سکتا ہے اور کہاں فضول یاوہ گوئی کر سکتا ہے۔

خوف کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جس شئے سے خوفزدہ ہو اس سے بھاگتا ہے اور اس سے دور رہتا ہے مثلاً انسان آگ سے ڈرتا ہے تو اس سے تحفظ کی تدابیر بھی اختیار کرتا ہے، گناہ اور خدا کی نافرمانی سانپ اور بچھو ہیں اور عذاب آخرت کا سبب ہیں اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ ان گناہوں سے ضرور بچتا ہے اور لازماً اللہ کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔

مسلمان دائمی خوف خداوندی کے باعث اللہ سبحانہٗ کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب کرتا ہے اور اپنے آپ کو عذاب آخرت سے بچاتا ہے اور اس کا ذریعہ تقویٰ الٰہی ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ انسان راہ خدا میں جہاد کرے اور اس کی جانب لوگوں کو دعوت دے اور اپنے رب کی ہدایت و رحمت حاصل کرے کہ اس کی ہدایت اور رحمت بھی ان لوگوں کے لئے ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۔ (الاعراف: ۱۵۴)

("ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے جو رب سے ڈرتے ہیں۔)

سوم: رجاء

ایمان کے عمیق اثرات میں سے ایک اثر اللہ سبحانہٗ کے ساتھ رجاء کا قائم رہنا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مومنین سے آخرت کے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور مایوسی اور ناامیدی سے منع فرمایا ہے، اس لئے سچے مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس وعدے پر یقین رکھے!

اس امید اور رجار کا فائدہ یہ ہوگا کہ مومن ان اسباب کے پورا کرنے میں لگا رہے گا جو فلاح اخروی کے ضامن اور اطاعت رب اور دعوت الی اللہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے گا۔

امید اور رجاء کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کو جو شئے محبوب ہو وہ اس کے انتظار سے لذت و سرور حاصل کرے اور اس کے اسباب فراہم کرنے کی سعی کرے کیونکہ اگر اسباب کے فراہم کرنے کی سعی کے بغیر رجار اختیار کرے تو یہ حماقت اور فریب نفس ہوگا۔ اس لئے لازماً اللہ سبحانہٗ سے رجار اور امید کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ اللہ کی رحمت اور تائید کا بندہ منتظر بھی ہو اور ساتھ ہی اس رحمت و تائید کے اسباب بھی مہیا کرے، اس طرح عمیق ایمان رکھنے والا مسلمان ان اسباب کی جانب بقدر امکان متوجہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی سستی نہیں کرتا اور اللہ سے خواستگار رہتا ہے کہ اگر اس کے اسباب میں کوئی کمی ہے تو وہ اس کو دُور فرما دے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص زرخیز زمین میں بیج ڈالتا ہے، پھر اسے پانی دیتا اور اس کی آبیاری کرتا ہے اور اس جدوجہد کے ساتھ اللہ سے امید رکھتا ہے کہ اس زمین کی پیداوار آفات سے محفوظ رہے اور اسے اچھی فصل حاصل ہو۔

مسلمان داعی کی حق سبحانہٗ سے رجاء ایک مسلسل عمل ہے، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا اس کی امید کبھی منقطع نہیں ہوتی، کیونکہ اسے تائید الٰہی، نصرتِ حق اور ثواب آخرت کا یقین کامل ہوتا ہے، اور اسی ایمان کی بدولت اللہ سبحانہٗ اس کی سعی و عمل کو نصرت و تائید سے سرفراز فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ سے تعلق

اللہ سبحانہٗ سے تعلق کا مفہوم اور اس کے اثرات۔

داعی حق ہر معاملہ میں اللہ سے تعلق قائم رکھتا ہے، جملہ مسائل میں اللہ پر توکل کرتا ہے، اسے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات یکتا منفرد اور بے مثال ہے وہی ہر نفع نقصان کا مالک اور ہر شئے کا دینے والا اور سلب کرنے والا ہے جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اس کی ذات ہی پر توکل کیا جا سکتا ہے۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق ۳)

("جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے")

بالخصوص اعلاء کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں اللہ پر توکل بے حد لازمی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى۔ (طٰہٰ ۴۵ : ۴۶)

("دونوں نے عرض کیا۔ پروردگار ہمیں اندیشہ ہے۔ کہ ہم پر زیادتی کرے گا۔ یا پل پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں")

حق سبحانہٗ کی یہ تائید اور یہ نصرت ایزدی انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام متقی بندوں کو شامل ہے اور بالخصوص داعیانِ حق ضرور اس میں داخل ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (النحل : ۱۲۸)

("اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں۔ اور احسان پر عمل کرتے ہیں")

داعئ حق کا ذات الٰہی پر توکل و اعتماد ایسا ہونا چاہیئے جیسے ایک بچہ کو ماں پر اعتماد

ہوتا ہے کہ اسے علاوہ ماں کے نہ کسی اور سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ کسی کی جدائی پر اس قدر بے تاب ہوتا ہے جس قدر ماں کی جدائی پر تڑپتا ہے اور جب اسے کوئی ضرورت پیش آئی ہے تو اس کی تکمیل کے لئے وہ ماں ہی کی طرف دستِ احتیاج بڑھاتا ہے۔

توکل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسباب ترک کر دیئے جائیں بلکہ ان اسباب سے وابستگی نہ اختیار کی جائے اور ان پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہونا چاہیئے۔

اب اللہ جل شانہ سے یہ اتصال و تعلق داعی حق کو اس یقین اور ایمان کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ کوئی مخلوق کسی بھی شے کی مالک نہیں ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی نفع یا نقصان نہیں ہے اور یہ کہ تمام امور بلا استثنار اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ ہی ہر شے کا خالق، مالک، مولی اور ناصر ہے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِيْنَ (آل عمران : ١٥٠)

("حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے")

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا (البقرہ : ٢٥٧)

("جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا حامی و مددگار اللہ ہے")

داعیٔ حق تمام امور میں اللہ پر اعتماد رکھتا اس کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھتا اور ہر نفع، نصرت اور تائید کا اسی سے متمنی رہتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا (الحج : ٣٨)

("یقیناً اللہ تعالیٰ مدافعت کرتا ہے۔ اُن لوگوں کی طرف جو ایمان لائے")

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ۔ (الصافات : ١٧١-١٧٣)

("اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے

گی ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا")

اللہ کی نصرت و تائید کا خود داعی حق کو کوئی وقت مقرر نہیں کر لینا چاہیئے اور نہ اس کی کیفیت اور تفصیلات کو کوئی نقشہ بنانا چاہیئے کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ۔ (غافر: ۵۱)

"یقین جانو کہ ہم اپنے رسول اور ایمان والوں کی اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے۔ جب گواہ کھڑے ہوں گے"

اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

"مدد کرنے سے بدلہ لینا مراد ہے خواہ وہ ان کی موجودگی میں ہو یا غیر موجودگی میں یا موت کے بعد، بس کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے ایذا پہنچانے والوں سے قدرت نے زبردست انتقام نہ لیا ہو چنانچہ حضرت یحییٰ، حضرت ذکریا اور حضرت اشعیاؑ کے قاتلوں پر خدا نے ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا اور انہوں نے انہیں زیر و زبر کر ڈالا، ان کے خون کی ندیاں بہادیں اور انہیں نہایت ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت عیسیٰؑ کو جن یہودیوں نے سولی دینے کی کوشش کی تھی ان پر جناب باری عزیز و حکیم نے رومیوں کو غالب کر دیا اور ان کے ہاتھوں ان کی سخت ذلت و اہانت ہوئی۔ امام سدّی فرماتے ہیں کہ جس قوم میں خدا کے رسول آئے یا ایمان دار بندے انہیں پیغام الٰہی پہنچانے کے لئے کھڑے ہوئے اور اس قوم نے ان نبیوں کی یا ان مومنوں کی بے حرمتی کی اور انہیں مارا پیٹا قتل کیا ضرور بالضرور اسی زمانے میں عذاب خدا ان پر برس پڑے نبیوں کے قتل کے بدلے لینے والے اُٹھ کھڑے ہوئے، انبیاء اور مومنین جو دنیا میں قتل کئے گئے ان کا دنیا ہی میں بدلہ لیا گیا اور اسی طرح ہمارے رسولﷺ کہ جس شہر سے ان کو ہجرت کرنا پڑی تھی اس شہر میں فاتح

بن کر واپس آئے"۔ [1]

داعی جب تک اللہ کے دین کی جانب دعوت اور اس کی نصرت میں لگا رہتا ہے اللہ سبحانہ، کی جانب سے اسے تائید ونصرت حاصل رہتی ہے

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ. (الحج: ۴۰)

("اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔")

داعی کو نصرت الٰہی میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف کے لوگوں نے بُرا بھلا کہہ کر اور برا سلوک کرکے نکال دیا تو آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اللہ ضرور مدد اور تائید کرنے والا ہے اور اپنے نبیؐ کو غلبہ عطا کرنے والا ہے۔

غرض داعی کبھی اور کسی صورت حال میں مایوس نہیں ہوتا اور ہمیشہ اس کا دل حق سبحانہ، کی جانب متوجہ رہتا ہے اور مایوسی صرف انکار کرنے والوں کے دلوں میں اور ان لوگوں کے قلوب میں سرایت کرتی ہے جن کا تعلق اپنے خالق اور مولیٰ سے ٹوٹا ہوا ہو۔

وَلَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ. (یوسف: ۸۷)

(اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں)

اللہ سبحانہ، سے مسلمان داعی کا مضبوط تعلق ضروری ہے اس لئے کہ اس تعلق کی بنا پر اس پر دشواریاں اور مصائب آسان ہو جائیں گے اور اس کے دل میں لوگوں کا خوف باقی نہیں رہے گا۔

---

[1]: تفسیر ابن کثیرؒ: ج ۴، ص ۸۲۔ تفسیر القرطبی، ج ۱۵۔ ص ۲۸

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ (آل عمران: ۱۷۳)

("جن سے لوگوں نے کہا تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں اُن سے ڈرو تو یہ سُن کر اُن کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے")

اسے ایمان کی عزت و عظمت کا احساس رہتا ہے کیونکہ اس کا تعلق قوی اور عزیز ذات سے ہوتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(المنافقون: ۸)

("حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے لئے ہے۔ مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں")

اس کی نظروں میں باطل اور باطل پرستوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی کہ سچے مؤمن پر باطل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تیسری فصل

داعی کے اخلاق

داعی اسلامی اخلاق سے متصف ہوتا ہے

داعی حق اس اسلامی اخلاق سے متصف ہوتا ہے جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے اور جس سے صحابۂ کرام متصف تھے اور جو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

اسلامی اخلاق کے چند امور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور بعض اسلامی اوصاف یہاں بیان کر رہے ہیں۔ داعی کو چاہیئے کہ وہ اس اسلامی اخلاق کو اپنائے اور جس قدر اس میں خامی ہو اس کو دور کرے اور صبر کرنے اور نیک عمل کرنے میں خدا کے فضل و کرم کا خواستگار رہے۔

اول: صدقِ مقال و صدقِ عمل

قرآن کریم کی متعدد آیات میں سچ بولنے کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور اس کی تاکید کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبہ ۱۱۹)

("اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔")

سچائی اور صدق مقال ہی روز قیامت بندہ کو اللہ کی ناراضگی سے بچائے گا اور اسے جنت میں لے جائے گا۔

هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (المائدہ ۱۱۹)

("یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی نفع دیتی ہے اُن کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے یہی بڑی کامیابی ہے۔")

صدق اور سچائی کی حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کو مکمل اجزاء اور پورے حصوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صدق قول میں بھی ہوتا ہے اور عمل میں بھی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ عزم و ارادہ کے ساتھ رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا اس کی جانب قدم بڑھاتے رہنا راہ حق سے دور لے جانے والی اور ہٹانے والی اشیاء سے بچنا اور ان سے نفرت کرنا اور خدا سے غافل اور جاہل اور دنیا کے ظاہری عیش پہ مرنے والے لوگوں سے اجتناب کرنا صدق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قلبِ صادق بہت حساس ہوتا ہے اور وہ ان رکاوٹوں سے خود دور رہتا ہے اور دنیا پرستوں کی ہم نشینی سے بیزار رہتا ہے اور ان لوگوں کے ساتھ خوش ہوتا ہے جو اطاعت الٰہی اور دعوت الی اللہ کے داعی ہوتے ہیں۔

غرض صدقِ مقال یہ ہے کہ ہر بات حق و صواب کی جائے اور کبھی غلط اور باطل بات زبان پر نہ آئے اور صدقِ اعمال یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اور احکام الٰہی کے موافق زندگی گذارے اور اسوۂ رسولؐ کی پوری پوری اتباع کرے۔

جب داعی میں صدق مقال اور صدق فی العمل کی یہ خصلت پختہ ہو جاتی ہے تو وہ صدیقیت کے درجہ میں داخل ہو جاتا ہے جو کہ ہر مومن کا مطلوب اور مقصود

ہے چنانچہ اللہ سبحانہ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ (الاسراء : ۸۰)

("اور دعا کرو کہ پروردگار مجھ کو تو جہاں بھی لے جا سچائی کے ساتھ لے جا۔ اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔")

مدخل صدق اور مخرج صدق کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس کام میں ہاتھ ڈالے اور جس کام کا آغاز کرے اس کا ہر آغاز و انجام اللہ کے لئے ہو اور احکام الٰہی کے مطابق ہو۔ اس کے تمام اعمال و افعال اللہ کے رضا سے مربوط ہوں اور وہ ان کی انجام دہی میں حق سبحانہ' کی رضا ملحوظ رکھے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الانعام : ۱۶۲)

("کہو میری نماز میری تمام مراسم عبودیت میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔")

مسلمان جب صدیقیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی نظر میں زندگی کی رغبت باقی نہیں رہتی بلکہ زندگی کا اصل مقصود رضائے الٰہی بن جاتی ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ

'اگر تین امور نہ ہوں تو مجھے زندگی سے کوئی الفت نہ ہو، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتا، اللہ کی عبادت کے لئے رات کو جاگنا اور ان لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا جن کی گفتگو بہترین ہوتی ہے۔')

حضرت عمر رضؓ کی مراد ان تین امور سے جہاد، نماز اور علم نافع ہیں، بشرطیکہ

رضائے الٰہی مقصود ہو۔[1]

داعی حق کے ایمان صادق کا اظہار اس کے چہرے اور اس کی آواز سے بھی ہوتا ہے چنانچہ نبی کریمؐ جب ایسے لوگوں سے گفتگو فرماتے جو آپؐ کو پہچانتے نہ ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے کہ یہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ اور ایک جھوٹے شخص کی آواز نہیں ہے۔[2]

بلاشبہ داعی کے چہرہ پر صدق کے اور اس کے لہجے کی صداقت مخاطب کو متاثر کرتی ہے اور اسے اس کی بات کے قبول کرنے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور کرتی ہے الا یہ کہ مخاطب ایسا شخص ہو جس کی نگاہ بصیرت بالکل ہی کجلا گئی ہو۔

بہرحال صدق داعی حق کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ ایمان کی اساس ہی صدق ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ داعی جھوٹا ہو کہ جھوٹ کی تاثیر تو یہ ہے کہ وہ آدمی کو برائیوں کی طرف لے جاتا ہے اس لئے بدکار اور جھوٹا شخص داعی الی اللہ نہیں ہو سکتا۔

دوم: صبر

صبر اسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ اور نصف ایمان ہے، قرآن کریم میں اسّی مقامات پر صبر کی تاکید کی گئی ہے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ﴿ (البقرة : ۴۵)

("صبر اور نماز سے مدد لو")

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لھم

(الاحقاف : ۳۵)

("اے نبی صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو")

---

[1] مدارج السالکین، ج ۲، ص ۲۸۱، ۲۸۲ - [2] البہی الخولی: تذکرہ الدعاۃ

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران: ۱۴۶)

("اور اللہ صابروں کو ہی پسند کرتا ہے")

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (البقرہ: ۱۵۳)

("بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے")

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (النساء: ۲۵)

("اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے")

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ: (الزمر: ۱۰)

("بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا")

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (لقمان: ۳۱)

(دراصل اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (الرعد: ۲۴)

- ("تم پر سلامتی ہو تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت تم آج اُس کے مستحق ہو")

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ. (السجدہ: ۲۴)

("اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کئے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے")

یہ قرآن کی چند آیات ہیں جن میں اللہ سبحانہ نے نماز کے ساتھ صبر کا حکم دیا، یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور صابرین کو معیت الٰہی حاصل ہوگی نیز صبر کرنے والوں کی جزا جنت بیان فرمائی۔

قرآن کریم کی طرح سنت نبویؐ میں بھی صبر کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ حدیث ہے کہ کسی بھی شخص کو صبر سے بڑی کوئی خیر عطا نہیں ہوئی ہے۔

نیز فرمایا۔

مومن کے لئے ہر صورت خیر ہے کہ اگر اسے بھلائی پہنچے تو وہ شکر کرے گا تو یہ اس کے لئے خیر ہوگی اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے گی تو صبر کرے گا اور یہ بھی اس کے لئے خیر ہوگی، صبر کے لغوی معنی رُک جانے اور ٹھہر جانے کے ہیں۔ اور از روئے شریعت اس کی تین اقسام ہیں۔

اطاعت الٰہی پر صبر (یعنی مداومت) معصیت الٰہی سے صبر (یعنی اجتناب) اور مصائب اور آزمائش پر صبر (یعنی ان کی برداشت)

اطاعت الٰہی پر صبر کی صورت یہ ہے کہ احکام الٰہی پر پابندی سے عمل کیا جائے، خلوص نیت موجود ہو اور جملہ اعمال سنت رسولؐ کے مطابق ہوں اس اطاعت شعاری میں معرفتِ الٰہی سے فائدہ پہنچتا ہے اور اس حقیقت کے جان لینے سے آسانی پیدا ہوتی ہے کہ اطاعت گزاروں کے لئے اللہ نے بڑا اجر رکھا ہے۔

معصیت اور گناہوں سے صبر کا طریقہ یہ ہوگا کہ برائیوں کو ترک کیا جائے اور گناہوں سے اجتناب کیا جائے اور عذاب الٰہی کے تصور سے اور ذہن میں استحضار سے اس صبر میں سہولت حاصل ہوتی ہے نیز اللہ سبحانہٗ سے حیا اور ان سے محبت اور ایمان کا بقا اور اس کی تقویت کا شعور اس صبر کی ہمت بخشتا ہے کیونکہ معصیت سے ایمان کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے۔

مصائب اور آزمائشوں پر صبر کا طریقہ یہ ہے کہ مصائب پر اور آزمائشوں پر ناراضگی کا اظہار نہ کرے صرف شکایت زبان پر نہ لائے اور تکلیف کو من جانب اللہ سمجھ کر برداشت کرے کہ صبر جمیل شکایت کا شعور اس صبر کی ہمت بخشتا ہے کیونکہ معصیت سے ایمان کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے۔

مصائب اور آزمائشوں پر صبر کا طریقہ یہ ہے کہ مصائب پر اور آزمائشوں پر ناراضگی کا اظہار نہ کرے حرفِ شکایت زبان پہ نہ لائے اور تکلیف کو من جانب اللہ سمجھ کر برداشت کرے کہ صبر جمیل شکایت کے منافی ہے چنانچہ اللہ سبحانہ نے حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یوسف۸۶)

(" اُس نے کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔")

حضرت ایوب کے بارے میں فرمایا۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

(الانبیاء: ۸۳)

(" جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے۔ اور تو ارحم الراحمین ہے"

ایک اور مقام پر حضرت ایوب ہی کے بارے میں فرمایا۔")

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص: ۴۴)

("ہم نے اُسے صابر پایا، بہترین بندہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا")

اس صبر کے لئے ضروری ہے کہ حق سبحانہ کی نعمتوں کا استحضار ہو کیونکہ اللہ کی نعمتیں بے شمار اور بے حساب ہیں، اگر انسان نعمتوں کی جانب نظر کرے تو مصیبت بہت ہی ہلکی معلوم ہو اور اسے ایسا محسوس ہو جیسے اسے ایک ہزار روپیہ ملا ہے اور اس نے ایک پیسہ کھویا ہے۔ نیز اس مصیبت پر جو عظیم اجر ملے گا اس کے ذہن میں استحضار سے بھی اس صبر میں مدد ملے گی۔

اللہ کے ساتھ صبر اور اللہ کے لئے صبر

صبر باللہ (اللہ کے ساتھ صبر) کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نصرت اور

اعانت سے صبر کرتا ہے اس لئے کہ فرمان الٰہی ہے۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللهِ (النحل : ۱۲۷)

("صبر کیجئے! اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے")

صبر للہ (اللہ کے لئے صبر) کا یہ مفہوم ہے کہ مسلمان اطاعت اور رضائے الٰہی کے لئے صبر کرے اور یہ صبر اطاعت پر صبر اور معصیت سے صبر کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے کیونکہ پہلے صبر میں اختیار اور محبت ہے اور دوسرے میں ضرورت کا پہلو ہے۔

انسان کو صبر کی ضرورت

صبر ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے کیونکہ صبر کے بغیر انسان کسی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے ناگوار باتوں کو برداشت کرنا اور انگیز کرنا لازمی ہے۔ مثلاً ایک طالب علم اپنے آپ کو دوسرے امور سے روک کر تعلیم میں اور مطالعہ میں لگائے رکھتا ہے اور اپنے آپ کو لذت و راحت سے روکتا ہے تاکہ امتحان میں کامیابی حاصل ہو، بہر حال ہر وہ شخص جسے کوئی مقصود حاصل کرنا ہو اسے صبر کرنا ضروری ہے۔

اور جس طرح افراد پر صبر لازم ہے اسی طرح اقوام پر بھی صبر لازم ہے۔ قوموں کو بھی اجتماعی طور پر تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں اور جنگوں کی سختیاں سہنی پڑتی ہیں اور بہت سی دشواریوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال ہر فرد کے لئے صبر ضروری ہے کیونکہ زندگی ناگوار امور دشواریوں صعوبتوں اور تکالیف سے بھری ہوئی ہے اگر انسان صبر سے ان کا مقابلہ نہیں کرے گا تو زندگی کا کارواں اسے کچل کر آگے بڑھ جائے گا۔

صبر اگرچہ ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے لیکن مسلمان کے لئے صبر اور بھی ضروری

ہے اس لئے کہ مسلم سے مطلوب ہے کہ وہ اپنے نفس کو معصیت سے روکے کہ معاصی میں نفس کو لذت ملتی ہے اور نفس کو ترک معصیت دشوار معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مسلمان شدید ضبط نفس اور ایسے قوی ارادے کا حاجت مند ہوتا ہے جو نفس کو ارتکاب گناہ سے روک سکے۔

مسلمان سے طاعتیں بھی مطلوب ہوتی ہیں اور اطاعت شعاری کے لئے بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ مقدر میں ہے انسان اس پر صبر کرے اور جزع و فزع کر کے ثواب نہ کھوئے اور گناہ نہ سمیٹے۔

داعی کے لئے صبر ضروری ہے۔

چونکہ صبر ہر انسان کے لئے ضروری ہے بالخصوص مسلمان کے لئے اور بالخصوص داعی حق کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے اس لئے کہ داعی حق دو میدانوں میں عمل کرتا ہے۔ یعنی ایک میدان اس کے نفس کا ہوتا ہے کہ وہ جہاد کرتا ہے اور اپنے نفس کو طاعت پر آمادہ کرتا اور معصیت سے باز رکھتا ہے اور دوسرا دائرہ کار دعوت الی اللہ کا ہے اور دونوں ہی پہلوؤں سے صبر بے حد ضروری ہے تاکہ داعی حق، راہ حق کی دشواری پر قابو پا سکے اور اس راستے کی تکالیف سے نبرد آزما ہو سکے کہ صبر کے نہ ہونے سے اس کی قوت عمل ختم ہو جائے گی اور وہ دعوت کے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔

آزمائش بھی ناگزیر ہے۔

راہِ حق میں آزمائش بھی ضروری ہے اور اس امتحان سے کامیابی سے گذرنے کے لئے بھی صبر ضروری ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

اَلٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ۔

(العنکبوت: ۲-۳)

(" اللہ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ وہ بس اتنے کہہ دینے پہ چھوڑ دیئے جائیں۔ کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں۔")

نیز فرمایا

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ (آل عمران: ۱۷۹)

(" اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہیں رہنے دے گا۔ جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔")

مزید فرمایا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (البقرۃ:۲۱۴)

(" پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے۔ جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے۔ اُن پہ سختیاں گذریں مصیبتیں آئیں مارے گئے۔ حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ ہاں بے شک اللہ کی مدد قریب ہے")

غرض زندگی میں آزمائشوں کا آنا عین سنت اللہ ہے اور اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو جب چاہے اور جس طرح چاہے ان کے نفوس میں موجود ایمان اور نفاق کا امتحان کر سکتا ہے، اور اس آزمائش کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں پہلی صورت تو خود احکام شرعیہ ہیں کہ وہ بھی آزمائش اور امتحان ہیں کہ بندہ مرغوبات نفس کو ترجیح دیتا ہے یا پروردگار کے پسندیدہ کاموں کو اختیار کرتا ہے اور جب بندہ رضائے الٰہی کو خواہش نفس پر ترجیح

دیتا ہے تو وہ اس آزمائش میں کامیاب رہتا ہے ورنہ ناکام ٹھہرتا ہے۔

یہ آزمائش کبھی کبھی مصائب اور آلام کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی بیماری آجاتی ہے۔ اعزہ مفقود ہو جاتے ہیں اور مالی نقصان پیش آجاتا ہے، ان حالات میں اگر مسلمان صبر کرے اور انا للہ پڑھے اور جزع فزع نہ کرے تو اسے صبر کرنے والوں کا ثواب ملے گا اور وہ اس آزمائش میں کامیاب ہوگا ورنہ خاسرین میں شمار ہوگا۔

داعی حق کی آزمائش

چونکہ زندگی میں آزمائشوں کا آنا سنت اللہ ہے اور داعیانِ حق کا آزمائش میں مبتلا ہونا بھی سنت اللہ کے مطابق ہے اور انہیں منکروں اور منافقوں کے ہاتھوں اذیتیں پہنچتی ہیں۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتّٰى أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ۔ (الانعام : ۳۴)

"(تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں۔ مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا۔ یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں آپ تک پہنچ چکی ہیں۔)" نیز فرمایا

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِينَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۔ (الحجر ۹۷-۹۹)

(ہمیں معلوم ہے جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت

ہوتی ہے۔ پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو اس کی جناب سجدہ بجا لاؤ۔ اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے"

اور فرمایا

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ

(الروم : ٦٠)

(" اے نبیؐ صبر کرو یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور ہرگز ہلکا نہ پائیں گے تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے")

یستخفنک کے معنی ہیں کہ آپ کو خفت، طیش اور عدم صبر پہ اکسائیں داعیانِ حق کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کے لئے اہل باطل کید کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور انہیں ایذائیں دیتے ہیں اور اپنی جہالت اور گمراہی سے انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ہمارے نبیؐ کے اصحاب کو مکہ میں بے انتہا تکالیف پہنچائی گئیں اور آپ انہیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔

' اے آلِ یاسر صبر کرو تمہارا وعدہ جنت ہے'

بہر حال داعیِ حق تکلیف کا مقابلہ کرتا ہے اور صبر جمیل اختیار کرتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے کیا اور اسی صبر پہ مومنین کے عزم اور ارادے کی اساس ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ۔

(لقمان: ١٧)

(" اور جو مصیبت بھی پڑے اُس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے")

نیز فرمایا۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا
الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا. وَإِن تَصْبِرُوا وَ
تَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (آل عمران : ۱۸۶)

"مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائش پیش آکر رہے گی۔ اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنوگے۔ اگر ان حالات میں تم صبر کرو اور خدا ترسی کی روش اختیار کرو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے"

مصائب سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا

سنت اللہ یہی ہے کہ آزمائش اور ابتلار، داعیٔ حق کو ضرور پیش آتی ہے تو کیا مسلمان داعی کو چاہیئے کہ وہ آزمائش کو دعوت دے اور اس کو دور نہ کرے، اس مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کا تعلق بری نیت وارادہ سے نہیں ہے بلکہ سوء فہم سے ہے۔

۱۔ مسلمان داعی سے پہلا مطلوب یہ ہے کہ وہ وسائل کے ادراک اور ان تمام کیفیات کو سمجھنے کے بعد جو قرآن کریم نے اور سنت نبویؐ نے بیان کی ہیں ان کے فہم کے ساتھ دعوت الی اللہ دے اور اگر از خود کوئی تکلیف آجائے تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور صبر کرے۔

۲۔ اگر تکلیف سے بچنے کی کوئی صورت ہو تو داعی کو چاہیئے کہ حالات اور ضرورتوں کے مطابق اس سے بچے کہ یہ تحفظ اختیار کرنا بعض صورتوں میں جائز ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہے، اس لئے کہ تکلیف نفس پر دشوار ہوتی ہے اور اس کی خواہش کرنا درست نہیں ہے کہ اس میں جو فتنہ ہے اس کا انجام معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان یہ سمجھے کہ اس کے نفس میں ابتلار کی برداشت کی قوت

پیدا ہو گئی ہے اور اب وہ بخوبی آزمائش کو برداشت کرسکتا ہے اور وہ یہ سوچے کہ اس طرح آزمائش میں پڑنے سے اسے ثواب ملے گا یا اسے یہ شیطانی وسوسہ آئے کہ وہ کس قدر زیادہ مصیبتوں پر صبر کرنے والا ہے لیکن جب مصیبت آئے تو وہ اسے برداشت نہ کرسکے اور دل تنگ ہو جائے اور اس آزمائش میں ناکام رہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ اے رب اب جس طرح چاہے تو میرا امتحان لے لے میں تیری تقدیر پہ راضی اور تیری آزمائش پر صبر کرنے والا ہوں، اللہ سبحانہٗ نے اسے احتباس بول (پیشاب کے بند ہو جانے) کی آزمائش میں ڈالدیا، اور وہ تکلیف کی شدت سے اپنی اولاد کو کہتا کہ اپنے جھوٹے چچا کو پتھر مارو۔

۳۔ کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالے اور پھر اس امتحان میں ناکام رہے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مومن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ کیوں کر ذلیل کرے، فرمایا کہ ایسی تکلیف میں اپنے آپ کو ڈالے جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔[1]

۴۔ ماثور دعاؤں میں معافی کی اور طلب عافیت کی دعائیں موجود ہیں اور مسلمانوں کو یہ دعائیں مانگنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ عافیت میں آزمائش اور تکلیفوں سے محفوظ رہنا بھی شامل ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل باطل سے خلاص ممدوح ہے۔ چنانچہ جب آپؐ نے حضرت اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنایا تو انہیں یہ نصیحت فرمائی کہ دشمنوں سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو، ہو سکتا ہے کہ تم ان کی وجہ سے آزمائش میں پڑ جاؤ، البتہ تمہیں یہ کہنا چاہیئے

---

[1] : امتاع الاسماع، ص ۲۸۔

کہ لے اللہ ہمیں انہیں کافی کردے اور ان کی قوت کو ہم سے دور کردے[1]

اسی طرح فرمان الٰہی ہے۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ (الاحزاب : ۲۵)

("اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لئے کافی ہے")

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ کا مومنین کو جنگ سے بچا لینا بھی نعمت ہے۔ اگر جنگ اور جنگ کی اذیت و تکلیف محمود ہوتی تو یہاں پر جنگ سے بچاؤ کو نعمت کے طور پر نہ بیان کیا جاتا۔

۶۔ یہ مطلوب نہیں ہے کہ اہل باطل ضرور اہل حق کو ایذا پہنچائیں، ظاہر ہے ان کی یہ ایذا رسانی برائی ہے اور مسلمان کے لئے یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ایذا، توہین اور تذلیل کا ہدف بنائے کہ یہ اس طرح سپرد کر دینا اللہ کی ناراضگی کا سبب اور اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالنا ہے اور اس لئے جائز نہیں ہے۔

۷۔ مکرہ (مجبور) کو یہاں تک اجازت ہے کہ وہ کلمۂ کفر کہہ لے اور اس طرح اپنے آپ کو تکلیف اور اذیت سے بچالے جو کہ اس امر کی دلیل ہے کہ اپنے آپ کو تکلیف سے بچانا جائز ہے اور مسلمان کو خود اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا چاہیئے۔

۸۔ جب حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ غزوۂ موتہ کے لشکر کے کچھ افراد مدینہ منورہ پہنچے تو اہل مدینہ نے مٹی پھینکی اور کہا کہ تم جنگ سے فرار ہو کر آئے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ فرار ہو کر نہیں آئے بلکہ یہ دوبارہ حملہ کرنے والے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت خالد اور ان کے ساتھی اذیت اور ضرر سے بچنے کے لئے دشمن کے مقابلے سے پیچھے ہٹ گئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پسپائی کو شکست کے بجائے فتح تصور کیا کہ وہ خود مارے جانے سے بچ

---

[1] : سیرۃ ابن ہشام ص ۳۲۳۔

گئے، دشمن کے قیدی پکڑ لائے اور دوبارہ حملہ کا موقع مل گیا۔

بہرحال مصیبت کا دور کرنا اگر ممکن ہو تو اسے ضرور دور کرنا چاہیئے اور جہاں تکلیف اور اذیت سے بچنا ممکن ہو وہاں از خود اپنے آپ کو ہدف بنانا نہ تو جائز ہے اور نہ قابل تعریف اقدام ہے۔

۹۔ مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی تاکہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں اور اپنی جانوں کو قریش کی اذیتوں سے بچا سکیں اور اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ مصیبت اور اذیت کو دور کرنا اور اپنے آپ کو اس سے بچانا لازمی ہے کیونکہ مسلمان کی جان اللہ کی ملک ہے، اس لئے بلا فائدہ اس کا اتلاف جائز نہیں ہے ایسا فائدہ جس سے اسلام کو تقویت پہنچے وہ فائدہ نہیں جو داعی کے ریا اور طلب شہرت کو ظاہر کرے کہ لوگ کہیں کہ یہ اللہ کی راہ میں مصائب کی برداشت میں کس قدر ثابت قدم ہے۔

۱۰۔ حضرت ابو طالب اپنے آباؤ اجداد کے دین پر تھے اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اعانت اور مدد قبول فرمائی اور جب آپؐ کے چچا ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا ایک ہی سال میں انتقال ہو گیا تو آپ نے اسے عام الحزن (سال اندوہ) فرمایا اور فرمایا کہ ابو طالب کی موت تک قریش کوئی ایسی بات حاصل نہ کر سکے جسے میں ناپسند کرتا ہوں، کہ آپؐ کے خاندان اور چچاؤں میں ابو طالب ہی آپؐ کی حمایت اور مدد کرنے والے تھے۔[۱]

جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس آئے تو آپؐ نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو پناہ دے تاکہ آپؐ اپنے رب کا

---

[۱]: امتاع الاسماع، ص ۱۸۔

پیغام پہنچا سکیں چنانچہ اس نے آپ کو پناہ دی اور آپ نے اسے دعوت الی اللہ دی۔[1]

ان تمام آثار سے یہی ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم کی حمایت قبول فرمائی اور آپ نے مطعم بن عدی کی پناہ قبول فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ داعی حق کا اپنے آپ سے مصیبت اور تکلیف کو دور کرنا اور اہل باطل کو اپنے اوپر دسترس حاصل نہ ہونے دینا مستحسن ہے۔ یہی عمل صحابۂ کرام نے کیا کہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور جب واپس مکہ مکرمہ پہنچے تو چھپ کر اور کسی نہ کسی کی پناہ حاصل کر کے داخل ہوئے۔[2]

نیز یہ امر بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان داعی کا اپنے نفس سے اذیت و تکلیف کو دور کرنا خود دعوت الی اللہ کے لئے مناسب ماحول فراہم کرنے میں مدد دیتا ہے، چنانچہ رسول اللہؐ ایام حج میں قبائل کی جانب تشریف لے جاتے انہیں دعوت اسلام دیتے اور فرماتے۔ کہ کون ہے جو مجھے اپنی حفاظت میں اپنی قوم کے پاس لے جائے اور میں وہاں جا کر اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں کہ اس پیغام کی اشاعت میں قریش رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔[3]

خلاصۂ کلام

قرآن کریم کی آیات، سنت نبویؐ اور عمل صحابۂ کرام سے درج ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔ داعیٔ حق کو جو تکالیف اور مصائب پیش آتے ہیں ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے انسان کو بیماری آتی ہے تو جس طرح انسان کے لئے نہ تو بیماری محبوب ہے اور نہ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ بیمار ہو جائے اور نہ اس کے بیمار ہونے کی خواہش نہ کرنا اس کے ایمان میں کوئی

---

[1]: ایضاً ص ۲۸

[2]: سیرۃ ابن ہشام ج ۱، ص ۳۸۸۔

[3]: امتاع الاسماع، ص، ۳۱۔

خلل ڈالنا ہے اسی طرح انسان کا مصائب اور تکالیف سے اپنے آپ کو بچانا اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں ڈالتا اور داعیٔ حق اپنے آپ کو باطل پرستوں کی ایذا رسانی سے بچانا کوئی غیر مناسب اقدام نہیں ہے۔

۲۔ اگر کوئی مصیبت آجائے تو داعی اسے برداشت کرے اور اسے اپنے دعوت کے کام میں رکاوٹ نہ بننے دے لیکن خود اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالے بلکہ ہر مشروع اور جائز طریقے سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کرے۔

۳۔ اگر دعوتی کام کے انجام دینے میں کوئی تکلیف پیش آجائے تو اس میں اللہ سے استعانت طلب کرے، صبر جمیل اختیار کرے اور یہ یقین رکھے کہ ہر معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ جو وہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔

سوم: جذبۂ رحمدلی

داعی کے اخلاق میں سے ایک خوبی نرم دلی اور رحم کرنا ہے، اس سلسلے میں پہلے چند احادیث نبویؐ بیان کی جاتی ہیں۔[۱]

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

'اس شخص پر رحم نہیں کیا جائے گا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔'

فرمایاؐ۔

'رحم کی صفت نہیں سلب ہوتی مگر کسی بدبخت سے'

فرمایاؐ

'رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے۔ تم اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'

---

۱ : تیسیر الوصول۔ ج ۲، ص ۱۱۲-۱۱۶-

روایت ہے کہ

"آپؐ نے حضرت حسنؓ کو پیار فرمایا، اقرع بن حابسؓ نے عرض کی کہ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے تو ان میں سے کسی کو بھی کبھی پیار نہیں کیا، آپؐ نے ان کی جانب دیکھا اور فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔"

نیز فرمایا:

"ایک عورت نے بلی باندھ کر ڈال دی نہ اسے کھانے کو دیا اور نہ اُسے آزاد کیا کہ گری پڑی چیزیں کھائے اور اس پر وہ عورت جہنم میں گئی۔"

ہمارے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں سے ایک خلق حسن آپؐ کی رحمدلی اور شفقت تھی چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے ارشاد فرمایا کہ

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ : ۱۲۸)

("تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے۔ جو خود تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے اور تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔"

یہ بھی آپؐ کی بے انتہا رحمدلی اور امت پر آپؐ کی شفقت ہے کہ آپؐ نے امت کو وہ تمام باتیں بتائیں جو امت کے افراد کو عذاب جہنم سے بچانے والی ہیں اور اس بات کو ایک بلیغ مثال سے واضح فرمایا کہ

انما مثلی و مثل امتی کمثل رجل استوقد نارا فجعلت الدواب والفراش یقعن فیہ فانا آخذ بحجزکم وانتم تقحمون فیہ۔ (صحیح مسلم)

"میری اور میری امت کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی اور پروانے اور مچھر اس میں گرنے لگے۔ تم بھی اس آگ میں گھسے جا رہے ہو اور میں تمہیں پشت سے پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں۔"

داعی کے لئے رحمدلی کی ضرورت

داعی حق کے لئے لازمی ہے کہ اس کا دل رحمت و رافت سے لبریز ہو وہ لوگوں سے رحمدلی سے پیش آئے اور ان کے لئے بھلائی اور خیر کا ارادہ رکھے اور اس کی حقیقی شفقت و محبت اس کا لوگوں کو اسلام کی جانب بلانا ہے کہ اس دعوت میں ان کی جہنم سے رستگاری اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ وہ لوگوں کے لئے وہی پسند کرتا ہے جو وہ دوسروں کے لئے کرتا ہے اور خود اس کے لئے سب سے زیادہ محبوب شئے ایمان اور ہدایت ہے اور اسی کو وہ سب کے لئے محبوب تصور کرتا ہے جس طرح ایک باپ اپنی اولاد پر شفقت کی بنا پر انہیں ہلاکت سے بچاتا ہے اور خود اپنے نفس کو تعب میں ڈالتا ہے اور ظاہر ہے کہ گمراہی سے بڑھ کر کوئی ہلاکت نہیں ہے اور داعی اپنی دعوت سے لوگوں کو اسی تباہی اور گمراہی سے بچاتا ہے۔

رحم دل داعی اپنی دعوت سے نہیں رکتا اور نہ اس سے تھکتا ہے اور نہ گمراہ لوگوں کا اعراض اور ان کی جہالت اور بے رخی اسے اس کام سے باز رکھتی ہے، بلکہ وہ مسلسل انہیں رشد و ہدایت کی تبلیغ کرتا رہتا ہے۔

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت پر کس قدر شفیق و رحیم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی قوموں کے حق میں اسی طرح شفیق و رحیم تھے اور انہیں عذاب الٰہی سے بچانے کی پوری سعی کرتے چنانچہ حضرت نوحؑ کے بارے میں آیا ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (الاعراف : ۵۹)

("ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔)

حضرت نوحؑ کا یہ فرمانا کہ میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں، ان کے اپنی قوم پر رحیم و شفیق ہونے پہ دلالت کرتا ہے اور یہ بات انہوں نے اس وقت فرمائی جبکہ ان کی قوم نے ان کو بھٹکا ہوا اور گمراہ کہا اور اس کا جواب اس طرح دیا۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (الاعراف: ۶۱-۶۳)

(اے برادرانِ قوم میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں. بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں. تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا ہے کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی ہے. تاکہ تمہیں خبردار کرے کہ تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت نوحؑ کا جواب بھی رحمت اور شفقت سے بھرپور ہے اور اس میں بھی آپ نرم دم گفتگو ہیں آپ اپنی جاہل قوم کی یاوہ گوئی پر ناراض نہیں ہوتے کیونکہ داعیٔ رحیم کبھی اپنی ذات کے لئے غصہ میں نہیں آتا۔

یہی اخلاق ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تھا کہ آپؐ کبھی اپنی ذات کے لئے ناراض نہیں ہوتے البتہ آپؐ اس وقت ناراض ہوتے جب اللہ کی حرمتیں پامال کی جاتیں۔

مزید یہ کہ حضرت نوحؑ نے ان تمام باتوں کے باوجود نصیحت خالص میں کوئی کمی نہیں کی اور انہیں یہ بات سمجھانے میں کوئی کمی نہیں کی کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ حق صریح کا قبول کرنا ان پر واجب ہے اور حق کا اس طرح

پہنچانا اور اس کے قبول کرنے کی دعوت دینا ان پر رحم کرنا ہے۔

رحمدلی کی بنا پر داعی پر کارِ دعوت آسان ہو جاتا ہے۔

داعی کی رحمدلی اس کے لئے اصحاب غفلت اور جہالت کی طرف سے کئے جانے والے برتاؤ کو آسان بنا دیتی ہے کیونکہ داعی انہیں اس مقام بلند سے دیکھتا ہے جس پر اسے اس کے ایمان اور یقین نے پہنچایا ہے اور وہ ان کی جانب اس طرح نظر کرتا ہے جس طرح بڑا چھوٹے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتا ہے کہ بچوں کو اپنے نفع نقصان کی خبر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب لوگ داعی کی دعوت سے اعراض کرتے ہیں تو اسے ان پر تعجب نہیں ہوتا جس طرح کہ بچے کو اگر کھیلنے سے منع کیا جائے یا آگ کے پاس جانے سے منع کیا جائے تو وہ چیختا چلاتا ہے۔

غرض داعی ہر حال میں دعوت دیتا ہے اور بار بار اپنی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کی اذیتیں برداشت کرتا ہے اور ان کو تبلیغ و ہدایت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی کریمؐ قریش کی ساری مخالفتوں کے باوجود ان کے سامنے بار بار دعوت رکھتے اور ان کی ایذا رسانی پر فرماتے اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے یہ جانتے نہیں ہیں۔

جس طرح بچہ کی نافرمانی سے بڑا بددل نہیں ہوتا اسی طرح لوگوں کے اعراض سے داعی حق بددل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی رحمدلی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی برائیوں پر مواخذہ نہیں کرتا۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۔

(الاعراف : ۱۹۹)

(" نرمی اور درگذر کا طریقہ اختیار کرو معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو")

رحمدلی عفو و درگذر پر منتج ہوتی ہے۔

داعیٔ حق جن لوگوں کو دعوت دیتا ہے ان سے نرمی اور رحمدلی کے ساتھ پیش آتا ہے اور خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاھلین پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے رویے سے اُسے جو تکلیف پہنچتی ہے اس پر انہیں معاف کر دیتا ہے اور اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کو درگذر کر دیتا ہے اور اس کا عمل اس آیت پر ہوتا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ (آل عمران: ۱۵۹)

(" ان کے قصور معاف کرو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو")

ترش روئی لوگوں سے دُور کر دیتی ہے

اگر داعی رحمدلی سے محروم ہو اور اس کی طبیعت میں سختی اور اس کے مزاج میں تُرش روئی ہو تو وہ کار دعوت میں کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ لوگ اس سے متنفر ہو جاتے اور دور بھاگنے لگتے ہیں اور اس کے قول میں نصیحت کی وہ تاثیر پیدا نہیں ہوتی جو شفقت اور رحمدلی سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ انسان کے قول پر اس کے دل کی تاثیرات مرتب ہوتی ہیں اور دل کی سختی کا اثر زبان و بیان کی سختی اور شدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو کہ غیر حکیمانہ ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (آل عمران: ۱۵۹)

(" یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُندخو اور سنگ دل ہوتے۔ تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے")

رسول خدا جو بات کرتا ہے وہ وحی ہوتی ہے اور برحق ہوتی ہے اس کے باوجود

اگر رسول غلیظ قلب (سخت دل) ہو تو لوگ اس کے پاس سے چھٹ جائیں تو ایک عام داعی اگر سخت دل اور ترش رو ہو گا تو اس کے برے اثرات بہت زیادہ ظاہر ہوں گے، اس لئے داعیان حق کو چاہیئے کہ وہ تقوی الٰہی اختیار کریں اور اگر طبعاً رحمدل نہ ہو تو اپنے آپ کو رحمدلی نرم مزاجی اور شگفتہ گفتاری کی عادت ڈالیں اور احتیاط رکھیں کہ کہیں غلظت قلب، سختی مزاج اور ترش روئی ذہ اسلامی اخلاق سے تہی نہ ہو جائیں۔ اگر رحمدلی کی عادت ڈالنے میں کامیاب نہ ہوں تو اپنے آپ کو دعوت کے کام سے علیحدہ کر کے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کریں۔

چہارم: تواضع

تکبر حماقت اور جہالت ہے

کسی انسان کا متکبر ہونا ایک بہت بڑی حماقت اور انتہا درجے کی جہالت ہے کیونکہ اگر بندہ اپنے رب کی معرفت حاصل کر لے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر عظمت اور ہر بڑائی صرف اللہ کے لیے ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق شانہ فرماتا ہے کہ

عزت میری آزار، بڑائی میری چادر، جو اس عزت اور بڑائی کو مجھ سے لینے کی کوشش کرے گا میں اسے عذاب دوں گا۔

جو شخص تکبر کرتا ہو اسے اپنے وجود پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے کہ اس کا آغاز ایک گندے نطفے سے ہوا ہے اور اس کا انجام ایک بدبودار لاشے کی صورت میں ہو گا۔

محمد بن الحسین بن علی کا قول الاحیا نے نقل کیا ہے کہ

جس انسان کے دل میں جتنا تکبر داخل ہوتا ہے اتنی ہی اس کی عقل میں کمی آ جاتی ہے۔

تکبر کرنے والوں کی جزاء

ایک متکبر شخص کی سب سے بڑی جزا اور کڑی سزا یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات سے سبق حاصل کرنے کلمۂ حق قبول کرنے اور حق کے رنگ میں رنگے جانے سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ ناکامی نامرادی اور اللہ کی ناراضگی ہوتا ہے اور یہ شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے جو متواضع اشخاص اپنے رب کی طرف سے حاصل کرتے ہیں۔

ان مفاہیم اخلاق کو قرآن و سنت نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔

فرمان الٰہی ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔

(الاعراف : ۱۴۶)

"میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا، جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ (غافر: ۳۵)

"اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔"

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ابراہیم: ۱۵)

"انہوں نے فیصلہ چاہا تھا، اور جبار دشمن نے منہ کی کھائی"

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (النحل: ۲۳)

"اور (اللہ) ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو عزّ نفس میں مبتلا ہے"

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۔

(غافر: ۶۰)

(جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ۔ ضرور وہ ذلیل و خوار جہنم میں داخل ہوں گے)

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا . وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (القصص : ۸۳)

(وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے ۔ جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں ۔ اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لئے ہے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

جب کوئی شخص تکبر کرتا ہے تو اس کا نام جبارین میں لکھا جاتا ہے اور اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو ان کا ہوتا ہے ۔

آپؐ نے فرمایا ۔

جنت میں کوئی ایسا شخص نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا ۔

اور فرمایا ۔

میں تمہیں بتلا دوں جہنم میں کون جائیں گے ، سرکش ، اکھڑ اور متکبر ۔

تکبر کی ممانعت

اوپر جو ہم نے قرآنی آیات اور احادیث ذکر کی ہیں ان سے بھی تکبر کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ ایسی نصوص بھی موجود ہیں جو براہ راست تکبر کی ممانعت پہ مشتمل ہیں ۔ مثلاً یہ فرمان الٰہی ۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۔ (لقمان : ۱۸)

(" اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین پہ اکڑ کر چل اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں فرماتا")

تکبر کی حقیقت

صحیح مسلم کی حدیث میں تکبر کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ حق بات کو رد کر دینا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا تکبر ہے، یعنی متکبر وہ ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسروں کو حقیر سمجھے اور اپنی اس روش سے رذائل اور مہلکات میں مبتلا ہو جائے۔

متکبر حق کو قبول نہیں کرتا، اس کی جانب نہیں جھکتا، اسی لئے اللہ سبحانہ' نے فرمایا ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل:۱۴)

(" انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔")

متکبر اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا اور اپنے برے عمل پہ نہیں پچھتاتا، اس لئے اس کی خودپسندی کی وجہ سے اسے اپنی برائی، برائی نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ

'تین امور ہلاک کر دینے والے ہیں، حرص شدید، خواہش نفس کی پیروی اور خودپسندی۔'

متکبر اپنے سوا دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے ان کی کوئی عزت نہیں کرتا اور اپنی لاعلمی کی صورت میں استفسار نہیں کرتا اور کسی کی تعلیم کو قبول نہیں کرتا اور کسی کی نصیحت پہ کان نہیں دھرتا اس لئے کہ وہ خود ہی اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ لوگ اس کی ستائش کرتے رہیں، وہ لوگوں سے بات کرنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے سے گریز کرنے لگتا ہے اور یہ سمجھتا ہے

کہ وہی ناجی ہے اور باقی سب تباہ حال اور ہلاک ہونے والے ہیں، یہ اور اسی قسم کے بے شمار مظاہر تکبر ہیں جن کا متکبر شخص اظہار کرتا رہتا ہے۔

تکبر کا سبب

تکبر کا سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ انسان اپنے علم، مال، اقتدار، عزت اور نسب کی وجہ سے خود پسندی میں مبتلا ہو جائے اور اپنے نفس کے پسند کرنے کے مشغلے میں منہمک ہو کر اللہ کو فراموش کر بیٹھے جو ان نعمتوں کا دینے والا ہے، اور جو اگر چاہے تو ان نعمتوں کو چھین سکتا ہے۔ اس خود پسندی کی وجہ سے وہ اپنی ذات کو عظیم سمجھ لیتا ہے اور لوگوں کے بالمقابل اپنے تفوق کا خیال دل میں بسا کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

تکبر کا علاج

اس مہلک بیماری کا حقیقی علاج تواضع اختیار کرنا ہے اور یہ تواضع اس وقت حاصل ہوگی جب انسان اللہ کی حقیقی عظمت اور اس کی کبریائی کی یقینی معرفت حاصل کرے گا اور یہ جان لے گا کہ فی الواقع کبریائی کا مستحق صرف اللہ جل شانہ، ہے اور کسی انسان کے لئے ہرگز یہ روا نہیں ہے کہ اس کے دل میں ایک ذرہ بھی تکبر کا داخل ہو کہ یہ انتہائی خطرناک جرثومہ ہے جو قلب میں داخل ہوتے ہی نور ایمان کو نگل لیتا ہے اور اعمال کو کھا جاتا ہے۔

متکبر شخص اپنے وجود کے بارے میں غور کرے کہ اس کا اپنا وجود کس قدر حقیر ہے کہ ناپاک پانی سے وجود میں آیا ہے اور پھر بدبودار اور متعفن لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس علم، عزت و دولت اور اقتدار ہے وہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور اللہ جب چاہے یہ نعمتیں چھین لے اور اس کے حصہ میں سوائے عدم کے اور نہ ہونے کے کچھ نہ رہے۔

پھر اس متکبر شخص کو غور کرنا چاہیئے کہ اس میں یہ اعجاب نفس کس طرح پیدا ہوا، خود پسندی نے کس طرح اس کو جکڑ لیا، اور تکبر کے کیا کیا اسباب ہوئے پھر ہر ایک سبب کو معلوم کر کے اسے ختم کرے کیونکہ جو کچھ وہ جانتا ہے وہ بہت کم ہے اور جو نہیں جانتا وہ بہت زیادہ ہے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (الاسراء : ۸۵)

" تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے "

وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (یوسف : ۷۶)

(" اور جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔ ")

تو تعجب اور کبر کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔

علم حقیقی سے تو عرفانِ الٰہی حاصل ہوتا ہے اس سے تو نفس کے رذائل اور حماقتیں دور ہوتی ہیں اور فضائل کی آبیاری ہوتی ہے اور تواضع پیدا ہوتی ہے۔

اگر متکبر شخص عبادت میں مصروف رہنے والا ہو تو اسے یہ غور کرنا چاہیئے کہ عبادت و تقویٰ اور تکبر میں تضاد ہے اور عبادت سے عجب نفس پیدا نہیں ہوتا بلکہ عبادت سے خود پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے، اسے کیا معلوم ہے کہ فی الواقع خدا کے یہاں اس کی عبادت مقبول ہو جائے گی اور اللہ کے یہاں صالحین میں اس کا شمار ہو گا جبکہ اپنے نفس کو پاکباز سمجھنے سے منع کیا گیا ہے۔

فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۔ (النجم : ۳۲)

" پس اپنے نفسوں کی پاکی کے دعوے نہ کرو وہی بہتر جانتا ہے۔ کہ واقعی متقی کون ہے "

عبادت تو بندے پر اللہ کا حق ہے اور فرض ہے، اگر کوئی انسان عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ پر کوئی احسان نہیں کرتا اور نہ اس کے لئے یہ روا ہے کہ وہ اپنی عبادت کو دوسروں پر تکبر کرنے کا ذریعہ بنا لے کہ یہ توفیق و سعادت اسے اللہ ہی نے عطا کی ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ (الاعراف : ۴۳)

("اور وہ کہیں گے کہ تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے، اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا")

تقویٰ کا دعویدار اللہ سے اس کی کبریائی میں مقابلہ کیسے کر سکتا ہے کہ ابلیس اسی تکبر کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا اور اس پر تاقیام قیامت لعنت کر دی گئی۔ ابلیس نے حضرت آدمؑ کو اسی وجہ سے تو سجدہ نہیں کیا تھا کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو گیا تھا، اسے اپنا وجود خوب معلوم ہوا اور اس نے یہ سمجھا تھا کہ وہ آدم سے بہتر ہے

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ

غرض دولت و سلطان ہو، یا عزت و اقتدار ہو، یا شوکت جمعیت یا نصرت اعوان ہو، یا حسب و نسب ہو، ان پر تکبر کرنا عمل شیطان ہے اور جو بھی ان میں سے کسی بات پر تکبر کرتا ہے وہ وہی شیطان پر چلتا ہے، دولت آنی جانی ہے، ہر مال و متاع فانی ہے، اقتدار کا ڈول اوپر نیچے آتا جاتا رہتا ہے اور اپنے گروہ کی مدد اور نصرت اعوان اللہ سے نہیں بچا سکتی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا

(التوبہ : ۲۵)

("ابھی حنین کے روز تمہیں کثرت تعداد پر غرہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔")

حسب و نسب پر افتخار کی حقیقت ہی کیا ہے سوائے بزرگوں کی بوسیدہ ہڈیوں پر اپنی عظمت کے محل تعمیر کرنے کے اور نیکوکار آباؤ اجداد کب اپنے بدکردار فرزندوں کی کوئی مدد کر سکے ہیں۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ

الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ قَالَ يَا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ
غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ
مِنَ الْجَاهِلِيْنَ. قَالَ رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ
وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْ اَكُنْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (هود: ۴۵-۴۷)

"نوح نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے۔ اور تیرا وعدہ سچا ہے تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ (جواب میں ارشاد ہوا) اے نوحؑ وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں میں سے نہ بنا لے نوحؑ نے فوراً عرض کیا۔ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں خسارے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

تواضع

تکبر اس کے اسباب اور اس کے نتائج کے بیان کے بعد تواضع کی حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ تواضع تکبر کی ضد اور عرفان الٰہی کا ثمرہ اور عرفان ذات کا نتیجہ ہے کیونکہ جو شخص اپنے رب سے آشنا ہو اور جو اپنے وجود کی حقیقت سے واقف ہو وہ کبھی متکبر نہیں ہو سکتا۔ یعنی متکبر اپنے رب سے ناآشنا ہوتا ہے اور متواضع کو عرفان الٰہی حاصل ہوتا ہے، متکبر اپنے ماسوا دوسرے لوگوں کو حقیر و کمتر سمجھتا ہے اور متواضع کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ کا یہ فرمان ہوتا ہے کہ

کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو حقیر نہ سمجھے کہ معلوم نہیں اللہ کے یہاں کس کا مقام بلند ہے۔

متکبر شخص نیکوکار لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے سے کتراتا ہے اور فقراء سے میل جول سے گریز کرتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں کہ خدا کی نظر میں یہ نیکوکار اس جیسے کتنے انسانوں کے برابر ہے، اور متواضع کے مدنظر یہ فرمان الٰہی ہوتا ہے

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ۔ (الکہف : ۲۸)

"اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں۔ ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو"

اس آیت کے نزول کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ قریش نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ ہم صہیب عمار، بلال اور خباب جیسے کمزور مسلمانوں کے پیروکار ہو جائیں، آپ انہیں اپنی مجلس سے نکال دیں اور جب ہم آپ کے پاس آئیں تو یہ موجود نہ ہوں، ہمارے جانے کے بعد آپ چاہیں تو انہیں بلا سکتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بعد ان سرکش اور متکبر سرداران قریش کے بارے میں فرمایا گیا۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا[1] (الکہف : ۲۸)

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشات نفس کی پیروی کی اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے"

متواضع کے مدنظر یہ آیت بھی ہوتی ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء : ۱۵)

"اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ"

---

[1] : ابن کثیرؒ : شمائل الرسول، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

متکبر حق سے گریز کرتا ہے اور متواضع حضرت فضیل بن عیاض کے اس قول کا ادراک کئے ہوئے ہوتا ہے کہ

"تواضع یہ ہے کہ تم حق کے سامنے سرنگوں ہو جاؤ، اگرچہ تم نے کلمۂ حق کسی جاہل آدمی کی زبان سے سنا ہو"۔

داعی کو تواضع کی ضرورت

اللہ کی مخلوقات میں تواضع کے خلق حسن کی سب سے زیادہ ضرورت داعی کو ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے اور انہیں دعوت الی اللہ دینی ہے اور اخلاق اسلام کی تعلیم دینی ہے، اس لئے اس کا اس اصل اور بنیادی اسلامی اخلاق سے عاری ہونا کارِ دعوت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں اللہ نے لوگوں کی فطرت یہ بنائی ہے کہ وہ اس شخص کی بات قبول نہیں کرتے جو ان پر اپنی برتری کا سکہ جمائے ان پر تکبر کا اظہار کرے اور انہیں حقیر و کمزور سمجھے، اور اپنی ہر بات کو حق اور سچ جتلائے، غرض لوگ متکبر کی سچی نصیحت سے بھی اعراض کرتے ہیں اور اس کے کلام اور وعظ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ان کے دل حق بات سے بھی متنفر ہو جاتے ہیں۔

بہر حال داعی کو اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لینا چاہیئے اور اپنے رب سے ڈرنا چاہیئے اور لوگوں کے لئے حق سے نفرت کا سبب نہیں بننا چاہیئے۔

اس مقام پر ایک اور امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عام طور پر لوگ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو اپنے بارے میں زیادہ باتیں کرے اور اپنی تعریفیں کرے اور انانیت کا اظہار کرے، اس لئے داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات سے اجتناب کرے، کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے تعلّی

کا اظہار ہو اور نہ اپنے علم، معرفت اور قادرالکلامی کو بیان کرے۔

داعی کے ذمے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک رکھے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ محض فضل الٰہی ہے جب لوگوں سے بات کرے۔ اسی یقین اور ادراک کے ساتھ کرے اور فضل الٰہی کو بیان کرے اور ہر نعمت کو اللہ ہی کی جانب منسوب کرے اس صورت میں اللہ لوگوں کے دلوں کو داعی حق کے لئے کھول دے گا اور اس کی دعوت کو خلق کے لئے باعث نفع بنا دے گا!

تواضع کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ شریعت نے جس کی اطاعت کا حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرے مثلاً امیر کی اطاعت کرے اور جو شخص اس کی تعلیم و تربیت کر رہا ہو اس کی اطاعت کرے اور اس اطاعت سے دل میں تنگی محسوس نہ کرے اور کبر خفی مانع نہ ہو اور غلط تاویلات کا سہارا لے کر اس سے گریز نہ کرے کہ شیطان اس صورت میں گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اور دل میں یہ بات ڈالے گا کہ یہ امیر یا معلم صالح نہیں ہے اور موزوں نہیں ہے اور میں علم میں اس سے زیادہ ہوں۔

یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کو جو نوجوان تھے۔ امیر لشکر مقرر فرمایا تھا حالانکہ لشکر میں بڑے بڑے مہاجر و انصار صحابہ موجود تھے

اس واقعہ کے بارے میں صاحب امتاع الاسماع فرماتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز منگل ۲۶ صفر کو اسامہ بن زید کو بلایا اور فرمایا کہ اے اسامہ، اللہ کا نام لے کر اور اس کی برکت کے ساتھ روانہ ہو جاؤ اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لو، بروز بدھ سرکار کی بیماری کا آغاز ہوا اور آپؐ کو درد اور بخار ہو گیا، اور جمعرات کے روز آپؐ نے

خود اسامہؓ کا جھنڈا باندھا، اور فرمایا کہ اے اسامہ، اللہ کا نام لے کر راہِ خدا میں جہاد کرو، کافروں کو قتل کرو، جنگ کرو عہد شکنی نہ کرو، کسی بچہ اور عورت کو نہ مارو دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرو، کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ یہ مقابلہ تمہارے لئے آزمائش بن جائے البتہ یہ دعا کرو کہ اے اللہ تو ان کی طرف سے کافی ہو جا اور ان کی شدت ہم سے دور کر دے، اور جب دشمن تمہارے مقابلے پر شور مچاتا آئے تو تم مقابلہ کے لئے اطمینان اور خاموشی سے بڑھو، آپس میں اختلاف نہ کرو کہ کہیں تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے اور یہ کہو کہ اے اللہ ہمیں جوڑے رکھ اور ہم تیری تائید و قوت کے ساتھ ان سے مقابلہ کرتے ہیں، اور جان لو کہ تلواروں کی لپک کے نیچے جنت ہے[۱]

کچھ حضرات نے حضرت اسامہ کی کم عمری کے بارے میں باتیں بھی کیں کہ اس لشکر میں مہاجرین و انصار بھی موجود تھے، حضرت عمرؓ نے ان باتوں کا جواب دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی آپؐ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور سر پر پٹی باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر تشریف فرما کر بعد حمد و ثنا اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگوں اسامہ کو امیر بنانے کے بارے میں مجھے یہ کیسی باتیں پہنچی ہیں، تم نے اگر ان کی امارت کے بارے میں باتیں کی ہیں تو تم نے ان کے والد کی امارت کے بارے میں بھی باتیں کی تھیں، یہ امارت کے اہل ہیں جس طرح کہ ان کے باپ اہل تھے۔[۲]

ہم نے حضرت اسامہ کے اس واقعہ کا بیشتر حصہ اس لئے نقل کیا ہے کہ اس میں بہت سی نصیحتیں اور عبرتیں موجود ہیں اور متعدد احکام پر مشتمل ہیں۔

غرض داعیٔ حق کو مساعی دعوت میں جس قدر کامیابی حاصل ہوتی جائے گی اور جس قدر اسے کار دعوت میں تائید الٰہی حاصل ہوتی جائے گی اتنی ہی اس

---

[۱]: امتاع الاسماع، ۵۳۶، ۵۳۷

[۲]: سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۷، ۲۵۸۔ امتاع الاسماع، ۵۳۷

کی تواضع کی صفت میں اضافہ ہوتا جائے گا تو دسرکار دو عالم، جب فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو سر مبارک. تواضع و انکسار کے ساتھ اپنے رب کے سامنے جھکا ہوا تھا۔

پنجم: میل جول اور عزلت نشینی

داعی حق کے لئے کون سا طریقہ زیادہ افضل ہے لوگوں سے تعلقات رکھنا یا عزلت نشینی اختیار کرنا؟ بعض نے کہا ہے کہ اختلاط افضل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ عزلت افضل ہے۔ لیکن درست یہ ہے کہ اگر حالات اور وقت کے لحاظ سے ایک مسلمان یہ سمجھے کہ اختلاط رضائے الٰہی کے مطابق ہے تو اختلاط افضل ہے اور اگر حالات اور وقت کی مناسبت سے ایک مسلمان یہ تصور کرے کہ عزلت میں رضائے الٰہی کی تکمیل ہو سکے گی تو وہ افضل ہے۔

انسانوں سے میل جول ضروری ہے

انسان مدنی الطبع ہے اور کوئی انسان منفرداً زندگی نہیں گذار سکتا اور اگر کوئی کامیاب بھی ہو جائے تو یہ ایک نادر صورت حال ہوگی، اس لئے انسان کا دوسرے انسانوں سے میل جول اور اختلاط ایک ناگزیر امر ہوا۔

یہ صورت تو دنیاوی معاملات کی ہے لیکن دینی امور میں بھی متعدد فرائض اور مستحبات ایسے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اختلاط ناگزیر ہے مثلاً نماز جمعہ اور عیدین، جنازہ میں شرکت، مریض کی عیادت، دینی امور کا سیکھنا اور سکھانا وغیرہ۔ اور اس قسم کے دیگر دینی امور میں اختلاط ناگزیر ہے۔

داعی پر اختلاط لازم ہے

اسلام کا اہم فریضہ دعوت الی اللہ ہے جس کے لئے اختلاط لازمی ہے بلکہ طبیعت اسلام ہی اختلاط کی متقاضی ہے کیونکہ اسلام انفرادی مذہب نہیں ہے بلکہ اجتماعی دین ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت سے نبوت سے سرفراز ہوئے اس وقت مسلسل لوگوں کے درمیان رہے انہیں اللہ کی جانب بلاتے رہے اور جن برائیوں میں وہ مبتلا تھے ان پر انہیں متنبہ کرتے رہے۔ اسی طرح صحابہ کرام نے لوگوں سے میل جول رکھا اور تعلیمات نبوت ان تک پہنچاتے رہے۔

بعض تابعین سے منقول ہے کہ انہوں نے عزلت کو پسند فرمایا اور اختلاط کو ناپسند کیا تو اس کی وجہ اس وقت کا خاص ماحول اور حالات ہیں اور یہ ایک استثنائی قاعدہ ہے اصول کلیہ نہیں ہے کیونکہ دعوت الی اللہ کا وجوب ثابت ہے اور اس کے لئے اختلاط ناگزیر ہے، بلکہ آج کل تو دعوت کے کام کی فرضیت اور اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے کہ مادیت کی تاریکیوں نے پوری انسانیت کو نگل لیا ہے اور حق کا نور دھندلا گیا ہے، اور اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان جہاں تک ممکن ہو کار دعوت میں مصروف ہو جائے اور کار دعوت کے لئے باہم میل جول ضروری ہے۔

اس اختلاط کے حدود

جو اختلاط دعوت کے کاموں کے انجام دینے اور فرائض اسلام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے وہی اختلاط واجب ہے اور لازم ہے اور جس میں یہ صفت موجود نہ ہو وہ اختلاط مباح، مکروہ یا حرام ہو جائے گا۔

یعنی اگر جائز دینوی ضرورت کے لئے اختلاط ہو تو وہ مباح ہے، اگر اس اختلاط سے کسی اخروی فائدے کو نقصان پہنچتا ہو تو مکروہ ہے۔ اس لحاظ سے داعی پر لازم ہے کہ اس کا اختلاط دعوت الی اللہ کے جذبے سے ہو اگر وہ کسی شخص سے ملاقات کرے، کسی کی رفاقت اختیار کرے کسی سے ہم نشینی اختیار کرے یا کسی سے گفتگو کرے تو دعوت الی اللہ کے پیش نظر کرے۔ اسی کے لئے مخاطب کو تیار کرے اور اسی پر گفتگو کرے۔

حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ

غرض داعی حق کے اختلاط اور میل جول کی اساس حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہوتی ہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے اللہ کی خاطر کرتا ہے اور جس سے دل کشیدہ ہوتا ہے اور اللہ کے لئے ہوتا ہے جس کو پسند کرتا ہے اسلئے پسند کرتا ہے کہ وہ خدا کا نیک اور اطاعت شعار بندہ ہے اور جس کو ناپسند کرتا ہے اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہے اور معصیتوں میں مبتلا ہے، جس قدر داعی حق کی حب الٰہی بڑھتی جائے گی اسی قدر اللہ کے نیک بندوں سے اس کی محبت بڑھتی جائے گی اور وہ ان نیک بندوں کے لئے اپنا جان و مال کھپانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا، کیونکہ اصول ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے تو اس کی ہر شے سے محبت رکھتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے اور اس کی ستائش کرتا ہے، جب انسانوں کے درمیان محبت کے یہ آثار ظاہر ہوتے ہیں تو بندہ کی اللہ سے محبت کی شان تو بہت ہی بلند ہے اور ظاہر ہے کہ اس محبت کے آثار اور نتائج بھی بہت بلند وسیع اور گہرے ہونے چاہئیں۔

اگر کوئی شخص خدا کی اطاعت بھی کرتا ہو اور اس کی نافرمانی بھی کرتا ہو تو داعی حق اس کی اطاعت الٰہی کی وجہ سے اس سے محبت کرے گا اور

اس کی نافرمانی کی وجہ سے اس سے عدم محبت کا اظہار کرے گا۔

داعی حق کا دائرہ رفاقت

چونکہ داعی حق جس سے محبت کرتا ہے اللہ کی خاطر کرتا ہے اور جس کو ناپسند کرتا ہے اللہ کی خاطر ناپسند کرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ داعی کی رفاقت میں وہی لوگ ہوں جو اللہ کی اطاعت کرنے والے ہوں، حق عبودیت کو پورا کرنے والے ہوں، اور فاسق، بداعمال اور رب کے احکام کی تعمیل نہ کرنے والوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اس لئے کہ فرمان الٰہی ہے۔

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا

(النجم: ۲۹)

(اے نبیؐ جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے۔ اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں اس سے اعراض کرو۔

لیکن اس عدم اختلاط اور اعراض کے باوجود انہیں دعوت دینے اللہ کی جانب بلانے اور ان کے لئے دعائے رحمت و ہدایت کرنے سے اجتناب نہ کرے۔

رفقائے کار کے ساتھ داعی کا طرز عمل

داعی حق کو حقوق رفاقت سے باخبر ہونا چاہیئے اور اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا چاہیئے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیئے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیئے۔ اِلّا یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت گفتگو کرے، اپنے نفس کے حق میں کی جانے والی ہر زیادتی کو برداشت کرے، ان کے عذر کو قبول کرے۔ اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھے کہ مومن

کریم اپنے بھائی کے محاسن پر نظر رکھتا ہے اور بدکار منافق اپنے بھائی کے عیوب گنتا رہتا ہے۔ اسی لئے عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے کہ

"مومن معذرت قبول کرتا ہے اور منافق کوتاہیوں کی تلاش میں رہتا ہے"۔

داعی کو ان لوگوں سے بھی جن سے اس کی موافقت اور تعلق نہیں ہے، نزاع نہیں کرنا چاہیئے اور اس آیت پر عمل کرنا چاہیئے

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا - (الفرقان: ۶۳)

("اور جب جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام")

انہیں ہر حال میں نصیحت کرنی چاہیئے اور کلمۂ دعوت پہنچانا چاہیئے اور اگر حالات ان سے بالکل قطع تعلق کے متقاضی ہوں تو قطع تعلق کر لینا چاہیئے، مثلاً اگر فاسق وفاجر بدعت کے داعی بنے ہوئے ہوں، مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے ہوں ان کو ایذارسانی کی تدبیریں کر رہے ہوں، ان پر زیادتیاں اور ظلم کر رہے ہوں اس حالت میں ان کو پوری نصیحت کر لینے اور ان کو بخوبی سمجھا لینے کے بعد ان سے قطع تعلق کر لینا زیادہ مناسب ہے اور ان سے کلام نہ کرے تاکہ انہیں اپنی حرکتوں پر سرزنش ہو جائے بلکہ ان کے سلام کا بھی جواب نہ دے تاکہ انہیں بخوبی تنبیہ ہو جائے اور امام غزالیؒ نے سلام کا جواب نہ دینے کی یہ توجیہ کی ہے کہ سلام کا جواب دینا اگرچہ فرض ہے مگر مصلحت کے مدنظر سلام کا جواب نہ دینا درست ہے چنانچہ بیت الخلاء اور غسل خانے میں سلام کا جواب ساقط ہے، اسی طرح برے آدمی کو اس کے اعمال پر متنبہ کرنے کے لئے اس کے سلام کا جواب نہ دینا بھی ایک مصلحت ہے۔[۱]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی اسی مفہوم کی تائید کی ہے۔[۲]

---

[۱]: احیاء علوم الدین، ج ۲ ص ۱۴۶۔

[۲]: مجموعۂ فتاویٰ شیخ الاسلام۔ ج ۸، ص ۲۱۶، ۲۱۸۔

داعی کی عزلت نشینی

اگرچہ دعوت الی اللہ کا تقاضا اختلاط اور میل جول ہے مگر ایک حد تک اس کے لئے عزلت نشینی اور تنہائی بھی لازمی ہے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ

"اللہ کے بندے کے لئے کچھ اوقات ایسے تنہائی کے ضروری ہیں جن میں وہ اکیلا اپنے خدا کو پکارے، ذکر الٰہی کرے، نماز پڑھے، فکر عقبیٰ کرے اور اپنے نفس اور اپنے قلب کا محاسبہ کرے۔"[1]

اس عزلت نشینی میں دو امور مدنظر رکھے جائیں۔

۱۔ خلوت نشینی ان اوقات میں اختیار کی جائے جن میں شریعت نے ایک خاص عبادت کو مستحب قرار دیا ہے۔ جیسے رمضان کا اعتکاف، رات کا قیام، اور نماز (انتظار صلوٰۃ) کے لئے مساجد میں جلوس، بالخصوص ان اوقات میں نماز ذکر اور دعا کے مشاغل خلوت اور عزلت کے بہترین اوقات ہوں گے۔

۲۔ اگر ان اوقات سے زائد بھی خلوت کی ضرورت محسوس ہو تو داعی اپنے گھر میں کچھ روز خلوت اختیار کرے، اپنے نفس کا حساب کرے اور اپنی کوتاہیوں کا شمار کرے اور اپنے نفس کو مزید دعوت الی اللہ کے لئے تیار کرے اور اس طرح اپنے آپ کو اس جہاد کے لئے تیار کرے جس طرح مجاہد ذرا جنگ کے میدان سے نکل آتا ہے تاکہ اپنی تلوار کی دھار تیز کرے، اپنے گھوڑے کو کھلا پلائے، اپنا نیزہ صاف کرلے اور اپنے زخموں پر دوا لگالے اور اس کی نیت یہی ہو کہ وہ دوبارہ جاکر جہاد میں شریک ہوگا تو اس کا یہ توقف بھی جہاد ہی ہے کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔

---

[1]: مجموع الفتاوی، ج ۱۰، ص ۶۳۷۔

داعی کی عزلت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ مجلس میں موجود ہوتے ہوئے اپنی سوچ کے لحاظ سے ان سے جدا ہو جائے۔ اس عزلت کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے جب داعی ایسے لوگوں کے درمیان گھر گیا ہو جو غیبتوں میں مبتلا ہوں، فضول یا وہ گوئی میں مصروف ہوں اور وہ نہ وہاں سے نکل سکے اور نہ اس گفتگو کا رُخ بدل سکے تو وہ اپنی روح سے غائب ہو جائے اور اپنے جسم کے ساتھ وہاں موجود رہے، اور ان کی کسی بات پر توجہ نہ کرے۔

داعی حق کی عزلت اور تنہائی کی ایک تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اللہ کے نافرمانوں سے علیحدہ ہو جائے اور ان کو چھوڑ دے جب وہ یہ سمجھ لے کہ ان پر نصیحت اثر نہیں کر سکتی اور ان کا سردست قبول دعوت کا امکان نہیں ہے اس لئے وہ انہیں چھوڑ کر دوسروں کو دعوت دینے میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ داعی کا وقت محدود ہے اگر اسے ایک جماعت کی جانب سے اجابت دعوت حاصل نہ ہو تو وہ دوسری جماعت کی جانب متوجہ ہو جائے بلکہ سب سے عزلت اختیار کرے جیسے حضرت ابراہیمؑ کا قول قرآن کریم میں مذکور ہے۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ (مریم ۴۸)

(میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں)

اور جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ (الدخان ۲۱)

("اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو")

اور اصحاب کہف کے بارے میں فرمایا گیا

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۔ (الکهف ۱۶)

"اب جبکہ تم ان کے معبودانِ غیر اللہ سے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں جا کر پناہ لو، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لئے سر و سامان مہیا کر دے گا۔"

تیسرا باب

مخاطبین دعوت

تمہید

ہم پہلے باب میں دعوت اسلام اور دوسرے باب میں داعی حق کے بارے میں بیان کر چکے ہیں اب ہم مخاطبین دعوت، ان کی اقسام اور ان کے متعلقہ دیگر امور کا بیان کرتے ہیں۔

اس باب میں دو فصلیں ہیں۔

پہلی فصل : مخاطبین دعوت اور ان کے متعلقہ امور

دوسری فصل : مخاطبین دعوت کی اقسام۔

پہلی فصل

مخاطبین دعوت

تمام انسان اور قیامت تک ہر دور اور ہر مقام پر آنے والے انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب ہیں اور دعوت الی اللہ کا محل ہیں، اس لئے کہ سرکار دوعالم خاتم النبیین کی نبوت ہر دور اور ہر زمانے اور ہر رنگ و نسل کے انسانوں کے لئے عام ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۱۵۸)

"اے محمدؐ کہو کہ انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں"

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸)

"اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"

یہ دعوت عام ہے اور اس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ ہر انسان مخاطب دعوت اور اس دعوت کو قبول کرنے کا مکلف ہے خواہ وہ کسی بھی رنگ ونسل اور علاقے سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ مرد ہو یا عورت اسی لئے حضرت محمدؐ پہ حضرت ابو بکرؓ بھی ایمان لائے، بلال حبشی بھی آپ پر ایمان لائے، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان آپؐ کی امت میں داخل ہوئے اور عورتوں میں حضرت خدیجہؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ اس قافلۂ ایمان میں شامل ہوئے اور حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند اور حضرت عمار بن یاسر جیسے بے مال و متاع اس قافلۂ حق کے مسافر بنے۔

غرض دعوت الی اللہ عام ہے، کسی خاص نسل اور کسی خاص دور کے لوگ اس کا مخاطب نہیں ہیں بلکہ تمام انسان مخاطب ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (البقرہ: ۲۱)

"لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی"

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

"اے بنی آدم ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو"

داعی پر لازم ہے کہ وہ اس دعوت کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے ہر اس انسان تک پہنچائے جس تک پہنچانا اس کے لئے ممکن ہو اور اپنے قریبی لوگوں کو پہلے دعوت دے کہ قریب کے لوگوں کو دعوت دینا سہل ہے اسی لئے حکم فرمایا گیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۴)

"اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ"

اگرچہ اس خطاب کا اولین رخ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے مگر اس کا مخاطب تمام داعیانِ حق ہیں اس لئے تمام دعاۃ کا یہ فریضہ ہے کہ پہلے رشتہ داروں اپنے خاندان والوں اور اپنے اہل تعارف لوگوں کو دعوت پہنچائیں بلکہ اگر داعی گھر کا نگران ہے تو اس سے اپنے گھر والوں کے بارے میں بازپرس ہوگی اس لئے سب سے پہلے اسے اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کو دعوت دین پہنچانی لازم اور فرض ہے، کیونکہ ہر انسان اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں جوابدہ ہے اور یہ جواب دہی امور دنیا میں بھی ہے اور امور آخرت میں بھی ہے اور اس بارے میں بھی ہے کہ اس نے اپنے گھر والوں کو کس قدر دین کی تعلیم دی اور امور اسلام کے بارے میں انہیں کیا کچھ سکھایا اور تربیت کی۔ اسی لئے اللہ سبحانہ نے اپنے ایک نبی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ (مریم : ۵۵)

"اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیتا تھا"

اور اسی طرح فرمایا

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم : ۶)

"بچاؤ اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو آگ سے"

اور ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور معروف کا حکم کیا جائے اور برائی سے منع کیا جائے۔

مخاطب دعوت کے حقوق

مخاطب دعوت کا پہلا حق یہ ہے کہ داعی خود اس کے پاس جائے اور گھر میں بیٹھ کر لوگوں کے آنے کا انتظار نہ کرے اس لئے کہ سرکار دوعالم خود تشریف

کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے، ان کو دعوت دے کر بلاتے تھے اور قبائل عرب حج کے ایام میں جب مکہ مکرمہ آتے تو ان کے پاس تشریف لے جاتے اور جو کوئی باہر سے مکہ آتا اس سے ملاقات کے لئے خود تشریف لے جاتے۔

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام حج میں عرب کے قبائل میں تشریف لے جاتے اور انہیں دعوت الی اللہ دیتے، اپنی نبوت کا اعلان فرماتے اور ان کو دعوت دیتے کہ وہ آپؐ کی تصدیق کریں اور ان کی تائید کریں تاکہ آپ اللہ کی دی ہوئی تعلیمات کو عام کر سکیں۔

آپؐ قبائل عرب کی فرودگاہوں پہ پہنچ کر اعلان فرماتے ہیں کہ

اے بنی فلاں، میں تمہاری جانب اللہ کا رسول مبعوث ہوا ہوں، تم ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ شریک نہ کرو، جن بتوں کی تم پوجا کر رہے ہو انہیں ترک کر دو، میرے اوپر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو، میری تائید کرو تاکہ اللہ کے پیغام کو پہنچا سکوں۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا کہ مکہ میں کوئی معزز اور صاحب حیثیت فرد آیا ہے آپؐ اس سے دعوت الی اللہ دیتے اور اپنا پیغام پیش کرتے۔[۱]

آپؐ نے صرف اسی پہ اکتفا نہیں کی آپؐ نے مکہ والوں کو دعوت دی اور مکہ آنے والوں کو دعوت دی بلکہ آپؐ دعوت کے لئے مکہ سے باہر بھی تشریف لے گئے آپؐ طائف گئے وہاں لوگوں کو دعوت دی، سرداران ثقیف کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دعوت دی۔

داعئ حق کے خود مخاطب دعوت کے پاس جانے کی تین وجوہ ہیں۔

---

[۱]: سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۱، ۳۲۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ جل شانہ، تبلیغ (پیغام حق کے پہنچا دینے) کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ حکم ہوا۔

یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدہ: ۶۷)

"(اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا۔ وہ لوگوں تک پہنچا دو")

اور فرمایا۔

وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (المائدہ: ۹۹)

("رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے")

اس پیغام حق کے پہنچا دینے کا طبعی تقاضا یہی ہے کہ رسول خدا ؐ خود اس پیغام کو لے کر جائیں کہ ہو سکتا ہے جن لوگوں کو دعوت پہنچانا مقصود ہے ان کو ابھی اس دعوت کا علم ہی نہ ہو۔ یا اگر علم ہو تو پیغام حق صحیح صورت میں نہ پہنچا ہو، یا اگر صحیح صورت میں پہنچا بھی ہو تو وہ اسے قبول کرتے نہ اٹھا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے تاکہ مخاطب خود آپ ؐ کی زبانی پیغام حق سن لے اور اُسے براہ راست دعوت حق پہنچ جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندوں پر اور اس کی مخلوقات پر بے حد شفیق اور رحیم تھے، آپ ؐ چاہتے کہ وہ ہدایت حاصل کرلیں کفر سے نجات پا جائیں اور دعوتِ حق قبول کرلیں، اس لئے آپ ؐ خود ان کی فرودگاہوں پر تشریف لے جاتے اور انہیں اللہ کا پیغام سناتے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے دور رہو دراصل اس کا قلب مریض ہوتا ہے اور مریض قلب نہ تو مرض کو مرض جانتے ہیں اور نہ انہیں اس کا احساس ہوتا ہے اور اس لئے وہ اس کے علاج کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے اس لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس جا کر ان کو مرض

اور اس کا علاج بتلائیں کیونکہ ان کے مرض کی اصل وجہ ان کا دعوت الٰہی سے اعراض ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر داعی مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کرنی چاہیئے اور لوگوں کے گھروں پر جا کر ان کی مجلسوں میں پہنچ کر انہیں دعوت دینی چاہیئے اور اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔

بہتر یہ ہے کہ مختلف علاقوں اور محلوں میں داعیوں کی مختلف جماعتیں جائیں اور تبلیغ کریں چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایک عالم ایک شہر یا ایک علاقے یا ایک محلہ میں تبلیغ کے فرائض انجام دے یا مسجد میں تعلیم دین کے فرائض پورے کرے اور لوگوں کو باخبر کرے کہ کون سے امور ان کے لئے آخرت کے لحاظ سے مفید ہیں اور کون سے نقصان دہ ہیں اور لوگوں کو خود جا کر دعوت دین دے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کا طریقہ تبلیغ یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کے پاس ان کے اجتماعات میں پہنچتے اور ان کے گھروں پر جا کر تبلیغ کرتے، ایک ایک فرد کی رشد و ہدایت کا اہتمام کرتے۔ علماء اور بادشاہوں پر یہ فرض ہے کہ وہ ہر بستی کے لئے اور ہر محلہ کے لئے کسی دیندار شخص کا بندوبست کریں جو لوگوں کو دین کی تعلیم دے اور انہیں دعوت حق دے۔[۱]

کسی انسان کی توہین نہ کی جائے

داعی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی انسان یا کسی شخص کو حقیر سمجھے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو داعی کمتر خیال کر رہا ہے اللہ کی میزان میں اس کا بڑا وزن ہو اور وہ مستقبل میں اسلام کی بڑی خدمت انجام دینے والا ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر انسان کو جس طرح بھی ملتے اور جو بھی آپ کے

---

[۱] الغزالی: احیاء علوم الدین، ج ۲، ص ۴۵۔

پاس آتا اسے دعوت حق دیتے تھے، آپؐ ہجرت سے تین سال پہلے حج کے ایام میں عرب قبائل کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دعوت حق دی مگر کسی نے آپؐ کی دعوت قبول نہیں کی۔ آپؐ منیٰ کی گھاٹی (عقبہ) کے پاس چھ خزرجی اشخاص کے پاس تشریف لے گئے جو حلق کرا رہے تھے۔ آپ ان کے پاس تشریف فرما ہو گئے انہیں دعوت الی اللہ دی۔ ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، وہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے اور مدینہ منورہ میں اپنی قوم کے لوگوں میں آپؐ کا ذکر کیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی، یہاں تک کہ انصار کے ہر گھر میں اسلام داخل ہو گیا[1]

یعنی آپؐ نے ان چھ افراد کی جماعت کو حقیر اور کم تعداد نہیں سمجھا، جبکہ مکہ مکرمہ آنے والے قبائل عرب نے آپؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا۔ خدا کی قدرت کہ یہی چھ افراد مدینہ منورہ میں اسلام کے داعی بن گئے اور ان کی وجہ سے مدینہ میں اسلام پھیل گیا۔

اس لئے داعی کو چاہیئے کہ وہ کسی فرد کو یا کسی مختصر سی جماعت کو حقیر نہ سمجھے اور اس تعداد کی کمی کے پیش نظر دعوت سے گریز نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس فرد کو داعی اس وقت حقیر سمجھ رہا ہے وہی دعوت حق کا بہترین سرمایہ بن جائے۔

مخاطب دعوت کے فرائض

جہاں مخاطب کے داعی کے ذمے یہ حقوق ہیں کہ وہ اس کے پاس جائے جو اسے دعوت الی اللہ دے۔ اسے کمتر نہ محسوس کرے اور اس کی اہانت نہ کرے تو مخاطب دعوت پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ دعوت حق پر لبیک کہے اور اپنے رب کی پکار پر دوڑ کر آئے۔

بیان حقیقت کے طور پر اور داعی کے دل میں پیدا ہونے والی مایوسی

[1] سیرۃ ابن ہشام: ج ۱، ص ۲۶۸

کے پیش نظر ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ تمام انسان برابر نہیں ہیں اور نہ ہی قبول حق میں ان کی طبیعتیں یکساں ہوتی ہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ دعوت سنتے ہی ایک کر اسے قبول کرتے ہیں اور بعض بے حد تامل سے کام لیتے ہیں اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان لوگوں کے بے شمار درجات ہیں کہ کوئی بلا تردد فوراً ایمان لے آتا ہے، جیسے وہ پہلے ہی سے منتظر ہو، پہلے ہی سے حق کی تلاش میں ہو اور جوں ہی حق اس کے سامنے آیا اس نے فوراً قبول کر لیا جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب نبی کریمؐ پر ایمان لاتے اور جس طرح ساحروں نے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا قبول کیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں خود سرکار دو عالمؐ کا ارشاد ہے کہ میں نے جس کو دعوت اسلام پیش کی اس نے کسی قدر تردد اور تامل کا اظہار کیا سوائے ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے بلا تردد اور بلا ادنیٰ تامل میری دعوت کو قبول کیا۔[۱]

ساحروں کے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے کا واقعہ خود قرآن کریم نے بیان کیا۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (الشعرا: ۴۵-۵۱)

---

[۱]: سیرۃ ابن ہشام: ج ۱، ص: ۲۶۸

(پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ یکایک ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا جا رہا تھا اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین کو موسیٰ اور ہارون کے رب کو فرعون نے کہا تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا اچھا ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا۔ اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف فرما دے گا۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔)

یہ ساحر فرعون کے کفر اور باطل کی تاکید کے لئے جمع ہوئے تھے اور حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے مقابلہ کے لئے آئے تھے لیکن جب انہوں نے معجزہ نبوت دیکھا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اس معجزہ کی وہ کیفیت و ماہیت نہیں ہے جو ان کے سحر کی ہے بلکہ یہ من عنداللہ ہے اور موسیٰؑ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے تو وہ فوراً اور برملا ایمان لے آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایمان کی کس قدر گہری تاثیر تھی جو ان کے قلوب میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ انہوں نے باطل کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دینے والا یہ واشگاف اعلان کیا کہ

آمنا برب العالمین رب موسیٰ وھارون

اور جب فرعون نے ان کو ڈرایا اور دھمکایا تو انہوں نے کہا کہ اب ہمیں اس عذاب دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ ہم اپنے ایمان کی جو جزا رب العالمین کے پاس پانے والے ہیں وہ بہت بڑی اور بہت زیادہ ہے اور ہمیں اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ہماری پچھلی خطائیں معاف فرما دے گا کہ ہم نے موسیٰؑ کا معجزہ سامنے آتے ہی ایمان قبول کر لیا۔

یہ دو مثالیں دعوت حق کی فوری قبولیت کی بیان کی گئی ہیں، جبکہ دعوت کی قبولیت میں بے حد تاخیر اور تامل کی مثالیں بے شمار ہیں، ہم یہاں بطور خاص قوم نوحؑ کا ذکر کریں گے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو برس دعوت حق دی مگر ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔ ابوسفیان اور طُلَقَاء اس وقت تک ایمان نہ لائے جب تک مکہ فتح نہیں ہوگیا اور بیس برس تک یہ لوگ ہر طرح کی عداوت کا اظہار کرتے رہے اور دعوت حق کے مقابلے کے لئے اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے رہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آخر وقت تک دعوت حق کو قبول نہیں کرتے اور کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔

مخاطب دعوت کا ایک فریضہ یہ ہے کہ جب وہ دعوت قبول کرلے تو وہ اپنی پوری زندگی کو منہاج اسلام کے مطابق استوار کرے اور اللہ کی اس طرح عبادت کرے جس طرح کہ اس کی عبادت قرآن نے اور سنت رسولؐ نے بیان کی ہے تاکہ اس کے اسلام میں کوئی شبہ اور شائبہ باقی نہ رہے اور پوری طرح مسلم (فرماں بردار) بن جائے اور مکمل طریقے پر اسلام کے حقوق ادا کرے۔

دوسری فصل

مخاطبین دعوت کی اقسام

تمہید

ہر معاشرے میں کچھ افراد اشراف قوم کہلاتے ہیں جن کے پاس اقتدار ہوتا ہے اور جو قومی سیادت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو قرآن کریم نے ملأ کہا ہے اور یہ مخاطبین دعوت کی پہلی صنف ہیں، جبکہ ان کے بالمقابل عامۃ الناس ہوتے ہیں جو مخاطبین دعوت کی دوسری صنف ہوتے ہیں۔ اور جب عام لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے مومنین کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور پورا معاشرہ اسلامی ہو جاتا ہے تو ایک اور قسم ظہور میں آتی ہے جو دل میں کفر کی محبت رکھتے ہیں اور بظاہر ریاکاری سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور یہ منافق ہوتے ہیں جیسا کہ اسلام قبول کرنے والے ضعیف الایمان افراد بھی ہوتے ہیں جو معاصی کی جانب آسانی سے متوجہ ہو جاتے ہیں اور ان کا پائے ثبات بہت جلد ڈگمگا جاتا ہے یہ گروہ عصاۃ کہلاتا ہے، ان کو ہم مخاطبین دعوت کی چوتھی قسم قرار دے سکتے ہیں اب ان اقسام کو مباحث ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

پہلا مبحث

مَلاَءُ

ملاء کی تعریف

قرآن کریم انبیاءؑ کے قصص میں مَلاَر کا لفظ آیا ہے اور مفسرین نے اس کے معنی بتائے ہیں اشراف قوم ان کے قائدین، سردار اور رئیسؒ۔ یعنی وہ تمام افراد جو معاشرے میں نمایاں حیثیت کے مالک اور صاحب اثر و نفوذ ہوں یا وہ معاشرے کی مروجہ اقدار کے تحت اپنے آپ کو باحیثیت تصور کرتے ہوں اور رواج کے مطابق لوگوں کی سربراہی کر رہے ہوں اگرچہ وہ فی الواقع اس کے مستحق نہ ہوں۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکاتیب میں ایران روم اور مصر کے سرداروں کو جن القابات سے مخاطب فرمایا اور روم کے سردار کو آپؐ نے عظیم الروم تحریر فرمایا، تو یہ درحقیقت بیانِ واقعہ کے طور پہ ہے اظہار حقیقت نہیں ہے یعنی وہ رومیوں کی نظر میں عظیم تھا اگرچہ وہ فی الواقع اس وصف کا مستحق نہیں تھا۔

ملاء اور دعوت الی اللہ

قرآن کریم میں ملار کا ذکر دعوت کے مخالفین کے طور پہ آیا ہے اور اس

ع۱: تفسیر القرطبی، ج ۲، ص ۲۴۳، ۲۴۴، ج ۱۲، ص ۱۲۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۲۲۳

طرح آیا ہے کہ انہوں نے دعوت کی شدید مخالفت کی اور انبیاء کرام کے خلاف جھوٹ گھڑنے، افتراء باندھنے اور لوگوں کو ان کی جانب متوجہ ہونے سے روکنے والوں کی سربراہی کی، چنانچہ فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (سبا: ۳۴، ۳۵)

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو۔ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھنے والے ہیں۔ ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"

اس آیت میں اللہ سبحانہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی رسول مبعوث ہوا ہے، اس قوم کے دولت مندوں، صاحب ثروت لوگوں اور عزت و قیادت والے لوگوں نے یہی کہا ہے کہ ہم نہ تو اس نبی پر ایمان لائیں گے اور نہ اس کی اتباع کریں گے[1]

حضرت نوحؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (الاعراف: ۵۹، ۶۰)

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔"

---

[1]: تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص: ۵۰۴

قوم نوح دعوت حق کے آگے دیوار بن گئی تھی، انہوں نے اپنے نبی کو بھٹکا ہوا کہا اور ان کی لائی ہوئی ہدایت کو گمراہی قرار دیا۔ یہی منطق اور یہی رویہ قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں اختیار کیا تھا انہوں نے بھی دعوتِ حق کی مزاحمت کی، آپؐ کو ہر طرح کی اذیتیں پہنچائیں، آپؐ کو جھوٹا اور آپ کے بارے میں اپنی مجلسوں میں سازشیں کیں۔

وَعَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ (ص: ۴-۷)

"ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا۔ منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے۔ کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر یہ بات تو کسی اور ہی غرض کی جارہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملت میں بھی کسی سے نہیں سنی یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔"

ان آیات میں بھی ملاء سے مراد سرداران قریش اور ان کے چودھری ہیں جو اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ اپنے سابق دین ہی پہ قائم رہو اور محمد کی دعوت دین پہ کوئی توجہ نہ دو[۱]

---

[۱]: تفسیر ابن کثیر : ج ۴، ص ۲۷۔

اس ملأ قریش کے بارے میں سیرت نبویؐ میں کافی تفصیلات ملتی ہیں کہ ان سرداران قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کی مزاحمت کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کئے اور کون کون سے اسالیب اپنائے، چنانچہ ابن ہشام اپنی سیرت میں ذکر کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبائل کی دعوت کو نکلتے تو ابولہب جو آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں سے کہتا جاتا کہ ان کی بات نہ سننا اور نہ ماننا[1]

اسی طرح جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم طائف پہنچے اور آپؐ نے وہاں کے سرداروں کو دعوت اسلام دی تو انہوں نے آپؐ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور آپؐ کے پیچھے منچلے، بیوقوف اور غلام لگا دیئے جو آپؐ پر آوازے کستے گئے اور آپؐ کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔[2]

اشراف قوم کی دعوت حق کی مخالفت کے اسباب

قصص الانبیاء کے مطالعے سے ہمارے سامنے وہ اسباب واضح ہو جاتے ہیں جن کی بنا پر ملأ (اشراف قوم) نے انبیاء کی عداوت اور دشمنی کو شعار بنایا ان کی دعوت کو رد کیا اور حق کو ماننے سے انکار کیا۔ ان اسباب میں سب سے اہم سبب تکبر ہے جو ان لوگوں کے نفوس میں جاگزیں اور وہ محبت تھی جو اپنے اقتدار اور معاشرے میں باعزت مقام کی ان کے دلوں میں رچی بسی تھی اور وہ جہالتیں تھیں جنہیں انہوں نے یقینی دلائل تصور کیا ہوا تھا۔

اب ہم ان اسباب کو اور ان کے ضمن میں وارد آیات اور آثار کو بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔

---

[1]: سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۲ [2]: سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۶، ۲۸

اوّل: تکبر

تکبر ایک بدترین اخلاق اور ایک بہت بری عادت ہے، یہ عادت نفس میں جاگزین ہو جاتی ہے اور مختلف پہلوؤں اور متنوع صورتوں میں اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ متکبر شخص کو حق نظر نہیں آتا اور اگر وہ حق کو حق محسوس کر بھی لیتا ہے تو اس کا تکبر قبول حق میں مانع بنا رہتا ہے اور اس کو اس سچائی کا اعتراف نہیں کرنے دیتا اور کسی بھی صاحب فضل کے فضل کو تسلیم کرنے میں حارج بن جاتا ہے۔

متکبر شخص خود اپنے نفس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہو پاتا اور اس کو اپنے وجود کی حقیقی قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا جس کی بنا پر وہ دوسروں کے بالمقابل اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے اور اس امر سے گریز کرتا ہے وہ کسی معاملے میں لوگوں کے ساتھ ہو یا ان کے تابع بن جائے۔

بسا اوقات تکبر کے ساتھ حسد بھی پیدا ہو جاتا ہے جس سے تکبر کی برائی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور حق سے باز رہنے اور اہل حق کی مخالفت اور عداوت کرنے میں اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۔ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا

(النمل، ۱۴)

("انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا")

فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا حالانکہ ان کی نفوس کو اس پر پورا یقین تھا اور اس انکار کی وجہ ان کا ظلم اور تکبر تھا۔

۲۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ
اِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الاعراف ۵۹ - ۶۰)

("ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا۔ ہم کو تو یہ نظر آتا ہے۔ کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔")

ملاء قوم نوحؑ نے حق کو حق نہیں سمجھا بلکہ اس کو گمراہی قرار دیا اور نور کو ظلمت تصور کیا بلکہ حد یہ کہ انہیں حق کھلی ہوئی ضلالت نظر آیا حالانکہ وہ خود کور چشم تھے، وہ خود بے بصیرت تھے کہ انہیں حق نظر نہ آیا اور یہ کور چشمی انہیں ہلاکت اور تباہی کی جانب لے گئی۔

وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ۔ (الاعراف ۶۴)

("اور ان لوگوں کو ڈبو دیا۔ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔")

۳۔ قرآن کریم نے قوم عاد کے اشراف (ملاء) کا قول نقل کیا کہ انہوں نے اپنے نبی حضرت ہودؑ سے کہا۔

اِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔

ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو (اعراف: ۶۶)

ان کی سفاہتؑ سے مراد بدعقلی، اور حماقت تھی اور یہ بات انہوں نے اپنے نبی کو کہی تھی حالانکہ اگر ان کے پاس چشم بینا ہوتی تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت ہودؑ انہیں حق کی جانب دعوت دے رہے ہیں۔

۴۔ ملاء قریش نے دعوت رسولؐ کو جھوٹ اور من گھڑت قرار

دیا اور آپؐ کو ساحر اور مجنون کہا

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ

(ص : ۷)

"یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"

۵۔ ملأ قوم نوحؑ کے بارے میں قرآن ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۔ (هود : ۲۷)

"جواب میں اس کی قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ بولے کہ ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل ہیں۔ بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کرلی ہے۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوتے ہو۔ بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔"

حضرت نوحؑ کی قوم کے اشراف نے اپنے نبی کے بارے میں کہا کہ تمہاری پیروی کمزور بے کسوں غریبوں اور معمولی پیشوں کے لوگوں نے کی ہے، سرداروں اور شرفاء نے تمہاری پیروی اختیار نہیں کی ہے مزید یہ کہ جو غریب و بے کس لوگ تمہارے متبع بن گئے ہیں یہ بھی کچھ سوچ سمجھ کر نہیں بنے ہیں بلکہ یونہی ایک خیال آیا اور وہ تمہارے پیچھے لگ گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس رسول کو ہم پر آخر کیا برتری حاصل ہے سوائے اس کے کہ ایک کذب بیان شخص ہے۔

ان تمام باتوں کا تعلق ان کے تکبر سے ہے جس کی وجہ سے ان

کی نظروں میں حقائق تبدیل ہو گئے اور وہ حق سے محض اس لئے گریزاں ہو گئے کہ اس حق کی اتباع گرے پڑے لوگوں نے کی ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حق بذاتِ خود حق ہے خواہ اس کی اتباع کرنے والے ضعیف اور کمزور لوگ ہوں، اور حق کی اتباع ہی شرف و عزت عطا کرنے والی ہے خواہ وہ بظاہر فقیر و بے کس ہوں اور فی الحقیقت حق سے عناد برتنے والے اور اس کی مخالفت کرنے والے ہی اراذل ہیں خواہ لوگوں کی نظروں میں وہ اشراف ہوں۔

۶۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ۔ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ۔ فَقَالُوْا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ فَکَذَّبُوْهُمَا فَکَانُوْا مِنَ الْمُهْلَکِیْنَ۔ (المومنون: ۴۵-۴۸)

(پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو کھلی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔ مگر انہوں نے تکبر کیا اور بڑی دوں کی سی۔ کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔ پس انہوں نے دونوں کو جھٹلایا اور ہلاک ہونے والوں میں ہو گئے۔)

فرعون نے اور اس کے شریک اقتدار درباریوں نے بر بنائے تکبر حق سے گریز کیا اور اپنے کفر کے حق میں ان جہالتوں کا ارتکاب کیا اور تکبر ہی کی وجہ سے فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ جس کے بارے میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ اس نے کہا۔

مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ (القصص: ۳۸)

(میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں مانتا۔)

اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (النازعات: ۲۴)

(میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)

۷۔ سیرت نبویؐ میں آیا ہے کہ ملأ قریش کہتے کہ ہم صہیب عمار
بلال اور خباب جیسے کمزور مسلمانوں کے ساتھ آپؐ کے پاس نہیں بیٹھیں گے پہلے آپؐ انہیں اپنی مجلس سے اٹھائیے
اور جب ہم گفتگو کر کے چلے جائیں تب آپؐ چاہیں تو انہیں بلا سکتے ہیں۔
اس پر فرمایا۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ۔ (الکھف : ۲۸)

اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت میں مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے
طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔)
اسی طرح ان متکبرین کے بارے میں فرمایا۔[1]

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ
وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکھف : ۲۸)

(کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل
کر دیا ہو۔ اور جس نے اپنے خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی اور جس کا طریق کار
افراط و تفریط پر مبنی ہے۔)

۸۔ متکبرین قریش اسلام کے بارے میں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے بارے میں کہا کرتے تھے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ
عَظِيْمٍ۔ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ
فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (الزخرف : ۳۱-۳۲)

(کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ
نازل ہوا کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کے گذر

---

[1] : ابن کثیر : شمائل الرسول، ص ۱۰۲، ۱۰۴۔

بسر کے ذرائع تو ہم نے ان میں تقسیم کئے ہیں۔")

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن پر اعتراض کرنے والے اور بربنائے تکبر اس پر اور اس کے لانے والے پر ایمان نہ لانے والے یہ کہتے تھے کہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار قریش پر کیوں نازل نہیں ہوا۔[1] جیسا کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ عظیم سے ان کی مراد کوئی بڑا سردار قریش تھی، کیونکہ وہ اپنے تکبر کی بنا پر اس بات کی کسر شان سمجھ رہے تھے کہ وہ رسول اللہؐ کی اتباع کریں۔ وہ آپؐ کو رسالت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اور ان کے بڑے بڑے لیڈر ہی رسالت اور وحی کے بھی مستحق ہیں، جس کا جواب اللہ نے یہ دیا کہ یہ معاملہ اللہ کی قدرت میں ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنے پیغام کے لئے کس کو منتخب کرے۔

دوم: ریاست اور عزت کی محبت

ملاء قوم کو عزت اور اقتدار بہت عزیز ہوتا ہے، کسی دین کے اختیار کرنے سے یہ عزت و اقتدار خطرے میں پڑتا ہے اس لئے وہ دعوت حق کے دشمن بن جاتے ہیں اور اپنی اس حق دشمنی کے لئے غلط اور ناروا جواز تلاش کر لیتے ہیں۔

اشراف قوم کی معاشرے میں عزت و اقتدار سے محبت اور اس کی حفاظت کی خاطر دعوت حق سے دشمنی اختیار کرنے کا بیان قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔

۱۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے قصہ میں فرمایا۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا

---

[1] : تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۱۲۶ / ۱۲۷۔

بِهٰذَا فِیْ آبَائِنَا الْاَوَّلِیْنَ ۔ (المومنون: ۲۴)

(اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے۔ یہ شخص کچھ بھی نہیں مگر ایک بشر تم ہی جیسا اس کی غرض یہ ہے۔ کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتہ بھیجتا یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں")

یہ ملأ اپنے قوم پر تسلط کو قائم رکھنے اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر اپنی قوم کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ نوحؑ تم پر اس دعوت کے ذریعے سے غلبہ پانا چاہتے ہیں اور تمہاری سرداری کے خواہاں ہیں اور مقصد یہ تھا کہ حضرت نوحؑ پر اقتدار کا یہ الزام لگا کر خود اقتدار پر قابض رہیں۔ کیونکہ اللہ کے رسول زمین میں برتری حاصل کرنے اور اپنی فرمانروائی کا سکہ جمانے اور فساد پھیلانے نہیں آتے البتہ ان کی دعوت کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ انہی کو سربراہی ملتی ہے اور انہی کا اقتدار قائم ہوتا ہے اور ان کا یہ اقتدار اپنی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے دنیا کے ہر اقتدار سے مختلف ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ سبحانہٗ فرعون اور اس کے درباریوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۔ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۔ وَقَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس۔ ۷۵۔ ۷۸)

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ و ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا۔ اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق اُن کے پاس آیا۔ تو انہوں نے کہہ دیا یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آگیا۔ کیا یہ جادو ہے۔ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کیا تو اس لئے آیا ہے

کہ ہمیں اس طریقے پر سے پھیر دے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا۔ اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے۔ تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔)

فرعون نے اور اس کے درباریوں نے تکبر کی بنا پر حق کو قبول نہیں کیا اور مجرم بن گئے اور اپنے حق سے گریز کی اس روش کی وجہ بیان کی کہ موسیٰ اور ہارون انہیں اس دین سے پھیر دینا چاہتے ہیں جس پر ان کے آباؤ اجداد رہے ہیں۔ یا یہ دونوں چاہتے ہیں کہ انہیں اقتدار مل جائے اور یہ عزت و شوکت کے حامل بن جائیں۔

غرض فرعون نے اور اس کے درباریوں نے قبول حق سے اپنے تکبر، اقتدار کی محبت اور معاشرے میں اپنی جاہ و عزت کے تحفظ کی خاطر انکار کیا اور حضرت موسیٰؑ اور ہارون پر یہ الزام لگایا کہ وہ اقتدار کے طلب گار ہیں کیونکہ فرعون یہ سمجھتا تھا کہ ان کی اس دعوتِ حق کا یہی مقصد ہے یا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس دعوت کا یہی انجام ہوتا ہے کہ اقتدار از خود اہل حق کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔

۴۔ قرآن ملأ قریش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ۔ (ص: ۶)

("سرداران قریش یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔ کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے")

تفسیر القرطبی نے قریش کے اس قول کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ بطور تنبیہ ہے کہ ان (محمدؐ) کا مقصد یہ ہے کہ یہ ہم پر اقتدار حاصل کریں اور ہم ان کے تابع ہو جائیں اور ہم پر جس طرح چاہیں حکمرانی چلائیں، اس لئے ان سے دور رہو اور ہرگز ان کی بات نہ مانو۔[۱]

تفسیر ابن کثیر میں ان ہذا لشیء یراد کے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے کہ محمدؐ ہمیں

---

[۱]: تفسیر القرطبی، ج ۱۵، ص ۱۵۱۔ ۱۵۲

"جس توحید کی دعوت دے رہے ہیں اس لئے ان کا مقصود خود عزت واقتدار حاصل کرنا ہے اور ہمیں اپنا متبع بنانا ہے، اس لئے اب ہم ان کی اس دعوت کو قبول ہی نہیں کریں گے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہی ہوا کہ قریش کے سربرآوردہ لوگ اپنی عزت اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر دعوتِ حق سے منہ موڑے ہوئے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس دعوت کے پھیل جانے سے ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا۔

سوم : جہالت

مَلَأ (سربرآوردہ لوگ) جہالت میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس جہالت کی بنا پر وہ اپنے رب کا کفر کرتے ہیں اور اس کی دعوت کو جو وہ اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعے بھیجتا ہے رد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہدایت نہیں گمراہی اور رسولوں کی جانب خفتِ عقل اور سفاہت منسوب کرتے ہیں۔

عوام الناس سب مل کر دشمن دین بن جاتے ہیں اور پیغمبر حق کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول کے جھوٹا ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ انسان ہے اور یہ سرداران پیغمبروں سے زیادہ پیغمبری کے حق دار ہیں کیونکہ ان کے پاس مال ہے اور عزت ہے اور جمعیت ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رسول انہیں ان کے آباؤ اجداد کے دین سے ہٹا دینا چاہتے ہیں اور ایک ایسے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں جس کے بارے میں ہم نے پہلے نہیں سُنا، پھر یہ لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ اصل بات کو نہیں سمجھے اور انہیں پتہ ہی کچھ نہیں ہے اور اسی ناسمجھی کی بنا پر انہوں نے بغیر غور کئے اور بلا سوچے دعوت الی اللہ کو قبول کر لیا اور رسول کی اتباع اختیار کر لی اور خود انہوں نے اس لئے ایسا نہیں کیا کہ وہ صاحب فہم و ادراک اور بابصیرت سردار ہیں۔

---

[1] : تفسیر ابن جریر، ج ۴، ص ۲۷۔

یہ سمجھتے ہیں کہ انبیاء کرام فساد کا باعث بنتے ہیں جبکہ وہ خود اصلاح کرتے ہیں اور لوگوں کے مذہب کی مدافعت کرتے ہیں اور ان کے حقوق کی نگہبانی کرتے ہیں اور اسی لئے وہ انبیاء سے مقابلہ اور جنگ کرتے ہیں۔

یہ ان کی جہالتوں اور حماقتوں کے مظاہر ہیں جو اللہ سبحانہٗ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پہ بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ ان کی گمراہی کے اسباب اور حق کے قبول نہ کرنے کی وجوہ ہیں۔

۱۔ قوم نوحؑ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ۔ (ھود: ۲۷)

"سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا بولے کہ ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی کرلی ہے۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے۔ جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے نبی حضرت نوحؑ کے بارے میں یہ اعتراض کیا کہ تم فرشتے نہیں ہو اس لئے تم نبی نہیں ہو سکتے اور ہمیں چھوڑ کر تمہارے اوپہ وحی نہیں آسکتی مزید یہ کہ تمہاری پیروی معاشرے کے گرے پڑے لوگوں نے کی ہے اس لئے ہم جیسے اشراف اور روساء تمہاری اتباع نہیں کر سکتے۔

ان کا یہ اعتراض ان کی جہالت پہ مبنی تھا ورنہ اگر انہیں علم و عقل حاصل ہوتے تو وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیتے کہ رسول کا انسان ہونا ضروری ہے تاکہ انسان اس کے خطاب کو اور اس کی گفتگو کو سمجھ سکیں۔

نیز اگر ان کے پاس عقل سلیم ہوتی تو وہ یہ بھی جان سکتے تھے کہ دین کے کسی معاملہ کا تعلق فقیری ضعیفی اور محرومی سے نہیں ہے بلکہ یہ لوگ حق کی اتباع کر کے اپنے حسن ادراک اور اپنے صفاتِ نفس کا ثبوت دیتے ہیں۔

۲۔ قوم ثمود نے اپنے نبی حضرت صالحؑ کے بارے میں کہا۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُوْنَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا إِنَّا بِالَّذِيْ آمَنْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ

(الاعراف: ۷۵، ۷۶)

(اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے۔ کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے۔ انہوں نے جواب دیا بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے۔ اسے ہم مانتے ہیں۔ ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔)

قوم ثمود کے سربرآوردہ لوگ بھی اسی جہالت پر مصر تھے اور حضرت صالحؑ کے نبوت کے انکار پر قائم تھے اور اسی لئے انہوں نے تکبر اور جہالت کے ساتھ مومنین سے یہ سوال کیا کہ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ صالح رسول خدا ہیں۔

۳۔ وَكَذٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ

(الزخرف: ۲۳)

(اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا ہے۔ اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔)

اس آیت میں مُترفون سے مراد وہی معاشرے کے سربرآوردہ لوگ (ملاء) ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بس ہمارے آباؤ اجداد جس طریقے پر چلتے آرہے تھے ہم بھی اسی روش پر گامزن ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ بات وہ اپنی جہالت کی بنا پر کہتے تھے، اس لئے کہ باطل کی اتباع نہیں ہوتی اور حق ہی کی پیروی کی جاتی ہے بلکہ قدیم باطل کی تقلید حق سے سرکشی کا ایک بڑا اہم سبب ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

(البقرہ : ۱۷۰)

اُن سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں۔ اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا یہ پھر بھی اُن کی پیروی کریں گے۔

۴۔ وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ. (الاعراف : ۱۲۷)

"فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی پیروی چھوڑ بیٹھے فرعون نے جواب دیا۔ میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا۔ اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے"

قوم فرعون کے سربرآوردہ لوگ حضرت موسیٰؑ اور ان کے متبعین کو زمین

میں فساد پھیلانا والا سمجھتے تھے اور فرعون کو ان پر سختی کرنے اور ختم کر دینے پر اکساتے تھے اور اس کی رجحان کا تکبر اور اپنے اقتدار سے محبت تھی۔

سربرآوردہ لوگوں کی ہر زمانے میں یہی روش ہوتی ہے

قرآن کریم نے سربرآوردہ لوگوں (مَلَاء) کے جو اوصاف بیان کئے ہیں اور ان کی جن عادتوں کی نشاندہی کی ہے وہ ہر زمانے اور ہر مقام پر انہی اوصاف اور انہی عادتوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور اسی طرح تکبر کی بنا پر دعوت حق کی مخالفت کرتے ہیں اور لوگوں پر اپنی سربراہی برقرار رکھنے کے لئے دعوت الی اللہ کے دشمن ہو جاتے ہیں اور اس خوف سے دعوت کا راستہ روکتے ہیں کہ کہیں اس دعوت کے پھیل جانے سے ان کا مقام و مرتبہ اور ان کی حیثیت نہ ختم ہو جائے

اس امر کی دلیل کہ معاشرہ کا سربرآوردہ طبقہ جس کے مفادات دعوت سے متاثر ہوتے ہوں ہمیشہ دعوتِ حق کی مخالفت کرتا ہے یہ ہے کہ گزشتہ اقوام کے ان سربرآوردہ لوگوں کو جن اسباب نے دعوت کی مخالفت پر مجبور کیا تھا وہ متکبر اور مترفین کے نفوس میں ہر دور میں موجود ہوتے ہیں کہ مرض تکبر ان کے دلوں میں روگ کی طرح لگا ہوتا ہے، سرداری کی تمنا اقتدار کی خواہش اور مقام و مرتبہ کی آرزو ان کے نفوس میں جاگزیں ہوتی ہے اور جہالت ان سب بیماریوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ کمزور و بے دلیل شبہات کا سہارا لے کر دعوت الی اللہ کی مخالفت کرتے ہیں اور راہ حق سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرمان الٰہی قال الملاء من قومہ

انا لنراك فی ضلال مبین کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ فاجر و فاسق لوگ ہمیشہ اصحاب ہدایت کے بارے میں یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں[۱]۔ اور اکثر یہی ہوا ہے کہ دعوت الی اللہ کو کمزور لوگوں نے قبول کیا ہے اور اشراف قوم نے اس کی مخالفت کی ہے، یہی تفسیر القرطبی نے بھی کی ہے[۲]۔

۱؎ : تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۴۰-۲۴۱

۲؎ : تفسیر القرطبی : ج ۱۵، ص ۱۵۰

مبحث دوم

جمہور عوام

جمہور عوام کی تعریف

عربی زبان میں جمہور کے معنی اکثر کے ہوتے ہیں اس لئے جمہور سے مراد عوام کی اکثریت ہے یعنی مَلَا، (اشراف قوم) کے علاوہ لوگ جو اکثریت میں ہوتے ہیں اور مقتدر اور صاحب حیثیت لوگ کم ہوتے ہیں اور عوام کی اکثریت غریبوں ناداروں اور کمزوروں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ مختلف پیشوں کو اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں اور عملاً اس اقلیت (ملأ ر) کے تابع ہوتے ہیں۔

جمہور عوام قبول دعوت حق میں پیش پیش ہوتے ہیں

جمہور عوام استجابت حق میں مقدم ہوتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کے متبع بنتے ہیں ان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابوسفیان جب شام گئے (جب وہ کافر تھے) تو ہرقل نے انہیں بلایا اور ان سے پوچھا کہ کیا محمدؐ کی اتباع اشراف قوم کر رہے ہیں یا کمزور عام لوگ، ابوسفیان نے جواب دیا ضعفاء قوم ان کی اتباع کر رہے ہیں[1]

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے رسولوں کے متبعین جمہور اور عام لوگ ہوا کرتے

[1] : صحیح البخاری ج ۱، ص ۹،۷

ہیں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے بارے میں اشراف قوم نے کہا

وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا (ھود: ۲۷)

"اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں ان لوگوں نے آپ کی پیروی کی ہے جو اراذل ہیں۔" اور قوم ثمود کے اشراف نے کہا۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ. (الاعراف: ۷۵)

("اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے۔ کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لائے آئے تھے کہا۔ کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے۔ انہوں نے جواب دیا بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے۔ اسے ہم مانتے ہیں۔")

اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مکہ میں متبعین کمزور و ضعیف لوگ تھے جن کو قریش نے بڑی تکلیفیں پہنچائی تھیں[1]۔

بہر حال جمہور عوام قبولِ دعوتِ حق کی جانب پہلے سبقت کرتے ہیں چنانچہ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر متبعین حق ضعفا رہوتے ہیں[2]۔

جمہور کے قبول حق میں سبقت کی وجہ

جمہور کے قبول حق میں سبقت اور عامۃ الناس کے دعوت الی اللہ کے قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں وہ موانع موجود نہیں ہوتے جو معاشرے

---

[1]: سیرۃ بن ہشام، ج ۱، ص ۳۳۹۔

[2]: تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۴۲۔

کے سربرآوردہ طبقے (ملًا) میں ہوتے ہیں اور جو قبول حق سے مانع بنتے ہیں یعنی سربرآوردہ طبقہ کے لوگوں کو قبول حق سے ان کا اقتدار اور ان کی شان و شوکت مانع ہوتی ہے، ان میں تکبر ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ کسی کے سامنے جھکنے اور انقیاد اختیار کرنے کو اپنی کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ القرطبی نے بھی اس نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان سربرآوردہ لوگوں کے قلوب پر تکبر اور عزّ و جاہ پسندی اور عیش کوشی کے ایسے غلاف پڑ جاتے ہیں کہ ان کا حق سے متاثر ہونا بے حد دشوار ہو جاتا ہے اور ان کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ انہیں نور حق نظر ہی نہیں آتا اور اپنی جہالت اور معاشرے میں حاصل شدہ مقام و مرتبہ کے تحفظ کی خاطر وہ حق دشمنی پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔

جمہور کا ملاَ سے متاثر ہونا

باوجودیکہ جمہور عوام میں بہت سے لوگ سلیم الفطرت ہوتے ہیں اور ان کے سامنے ایمان کے قبول کرنے کے بہت سے مواقع ہوتے ہیں اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ دعوتِ حق کو قبول کر لیتے ہیں لیکن ان کے اپنے معاشرے کے سربرآوردہ افراد (ملًا) سے متاثر ہونے کے امکانات بھی خاصے ہوتے ہیں اور وہ اکثر ان لوگوں کے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں اور انہی کے بتائے ہوئے گمراہی کے راستوں اور انہی کے القاء کئے ہوئے اکاذیب پر چل پڑتے ہیں، جیسا کہ قوم فرعون نے باطل میں فرعون کی پیروی کی اور اس کے مددگار بن گئے۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (الزخرف:۵۴)

"انہوں نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان کی خفت عقل انہیں گمراہی کی پگڈنڈیوں پر لے چلی اور وہ بلا تامل گمراہی قبول کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ فرعون کی قوت فتنہ بہت زیادہ تھی کہ اس کے پاس ملک و اقتدار اور دولت و اعوان سب ہی کچھ موجود تھا، جبکہ اس کی قوم علم نافع، فہم راجح، اور ہدایت سے بے بہرہ تھی اس لئے وہ اس کے فتنہ اور اس کے باطل میں گرفتار ہو گئے، اور انہی وجوہ کی بنا پر انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو رد کیا۔

فَاتَّبَعُوْا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (هود۔ ۹۷)

"انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا"

قوم کے سربرآوردہ لوگ اور مقتدر طبقہ جس طرح عوام کو گمراہ کرتا ہے ایک مقام پر قرآن نے اس کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨ الْقَوْلَ ج يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ط وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۔ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (سبا: ۳۱-۳۳)

"کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے۔ وہ بڑے

بننے والوں سے کہیں گے، کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے۔ کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا۔ جو تمہارے پاس آئی تھی۔ نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے۔ نہیں بلکہ شب و روز کی مکاری تھی۔ جب تم ہم سے کہتے تھے۔ کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیئے جائیں گے۔ تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے۔ اور ہم ان منکروں کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کے سوا اس کے اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے۔ ویسے کی جزا پائیں"

ان آیات کریمہ میں اللہ سبحانہ نے بتلایا ہے کہ کفار کس طرح اپنی سرکشی عناد اور قرآن کریم پر عدم ایمان پر مصر رہتے ہیں اور اللہ سبحانہ نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی روش پر تا قیامت قائم رہیں گے اور اسی حالت میں اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں گے اور نزاع کریں گے حالانکہ دنیا میں ایک دوسرے کے مددگار اور حامی تھے۔

کمزور و ضعیف عامۃ الناس اپنے سرداروں، صاحب اقتدار لوگوں اور سربرآوردہ طبقہ سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں راہ حق سے روکا تھا اگر تم سدِ راہ نہ بنتے تو ہم تو یقیناً اس حق کو قبول کر لیتے۔

لولا انتم لکنا مؤمنین

اس پر سربرآوردہ لوگ اور سرداران قوم کہیں گے ہم نے تو تمہیں نہیں روکا تھا بلکہ خود تم نے بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی برہان کے ہماری اتباع کی تھی اور خود دنیا کو اختیار کرنے کی خاطر دلیل حق سے اور اتباع ہدایت سے منہ موڑا تھا اور رسولوں کے دلائل حق کو رد کر کے ہمارے کئے ہوئے وعدوں پر چل پڑے تھے اور خود

ہی اپنی مرضی سے گمراہی اختیار کی تھی اور مجرم بنے تھے۔

نحن صددناکم عن الھدی بعد اذجاءکم

اس کے جواب میں اکثریت کفار کہے گی کہ تم ہمیں رات دن دھوکہ دیتے رہے ہر طرح مبتلائے فریب کئے رکھا آرزوؤں اور تمناؤں میں الجھائے رکھا یہی کہتے رہے کہ یہ دعوتِ حق باطل ہے، تم ہی ہمیں حکم دیتے رہے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور اس کے شریک بنائیں تم ہمیں باور کراتے رہے کہ تم صحیح راستے پر چل رہے ہو اور دعوتِ حق باطل ہے۔ تمہاری اس شب و روز کی تلقین ہی نے ہمیں کافر بنایا ہے اور اسی طرح تزیین باطل نے ہمیں راہ حق سے بھٹکایا ہے۔

بعد ازاں اللہ سبحانہٗ ہمیں بتلاتے ہیں کہ سردار ہوں یا عام لوگ عذاب کو دیکھ کر سب ہی کے دلوں میں پشیمانی بیٹھ جائے گی مگر اس وقت ندامت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور ان کے اعمال کی جزا کے طور پر ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے جائیں گے اور سرداروں اور عام لوگوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں عذاب ہوگا[1]

جمہور ملاء سے کیوں متاثر ہوتے ہیں

ہم نے بتایا ہے کہ جمہور عوام میں قبول حق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور یہ بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کے اپنی قوم کے سرکردہ افراد اور ان کے باطل سے متاثر ہونے کے بھی زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور اس کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔

---

[1]: تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۵۳۹ - تفسیر القرطبی، ج ۱۴، ص ۳۰۲، ۳۰۴ -

پہلا سبب

چونکہ کافر سر برآوردہ طبقہ کے پاس اثرونفوذ اور قوت واقتدار ہوتا ہے اور وہ اپنے اس اثر و اقتدار سے کفر سے نکلنے کا ارادہ کرنے والوں کو خوفزدہ کئے رکھتے ہیں جس سے ان کی ہمتیں پست اور ان کے عزائم مردہ ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی جان کی سلامتی کی خاطر اور اپنے آپ کو تکالیف سے بچانے کی خاطر کفر کی روش پر قائم رہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ (یونس: ۸۳)

"موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہیں مانا فرعون کے ڈر سے۔ اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے کہ فرعون اُن کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین پر غلبہ رکھتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد میں رُکنے والے نہ تھے۔"

فرعون کی گرفت اور اس کے طبقۂ حاکم کے محاسبہ کے خوف سے اکثریت ایمان نہیں لائی کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اقتدار وقت ان کی زندگی کو عذاب جان نہ بنادے اور بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی نکلی جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے اور وہ فرعون سے خوفزدہ نہیں ہوئے جیسا کہ ساحروں کی جماعت ایمان لے آئی اور انہوں نے برملا موسیٰؑ پر ایمان لائے اور دعوتِ حق کو قبول کرنے کا اعلان کیا اور کسی صلیب، قتل اور تعذیب کا انہیں کوئی خوف نہیں ہوا بلکہ فرعون کی دھمکیوں پر انہوں نے کہا۔

لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (الشعراء ۵۰-۵۱)

"کچھ پرواہ نہیں کہ ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف فرمادے گا۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔"

اسی طرح ہر تعذیب اور ہر سختی کے باوجود اصحاب اخدود ایمان لے آئے جو بہت کم تعداد میں تھے جبکہ اکثریت اپنے طبقۂ حاکم کے ڈر اور خوف سے ایمان نہیں لائی اور انہیں مہلت ملتی گئی اور کفر پر راضی ہوتے گئے اور اس پر جم گئے حالانکہ پہلے وہ کفر کو ناپسند کرتے تھے اور اس سے نکلنا چاہتے تھے اور ان کی اسی روش اور ان کو ایک ہمہ گیر عذاب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

اسی طرح خوف کی بناء پر اتباع حق سے گریز کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں بھی کیا ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ۔ (ھود :- ۵۹)

"یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے"

دوسرا سبب

قوم کے حکمراں اور معاشرے کے متفوق لوگ عام لوگوں کو دولت دنیا کا لالچ اور آسائش حیات کی طمع دلاتے ہیں اور ان کو اس طرح اپنے باطل پر قائم رہنے اور اپنی قیادت کی اتباع پر راضی رکھتے ہیں۔

چنانچہ قرآن قوم نوح کے تذکرہ میں اس جانب اشارہ فرماتا ہے۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا۔ (نوح : ۲۱)

"نوح نے کہا، میرے رب انہوں نے میری بات رد کر دی۔ اور ان کی پیروی کی جو مال اور اولاد اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں"

یعنی قوم نوحؑ نے اپنے سرداروں اور اپنے لیڈروں کی اتباع کی اور ان لوگوں کے پیچھے چل پڑے جن کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی۔ اس آرزو میں کہ شاید انہیں بھی کچھ متاعِ دنیا میسر آجائے چنانچہ اللہ سبحانہٗ فرعون کا قول نقل کر کے اس جانب اشارہ فرماتے ہیں۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الزخرف:۵۱)

"ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہیں۔ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا"

فرعون نے عوام الناس کو یہ لالچ دیا کہ میرے قبضے میں پورا ملک ہے، ہر طرح کے اسباب حیات موجود ہیں اور یہ کہ میں جسے چاہوں یہ مادی اسباب زندگی فراہم کر سکتا ہوں، شرط یہ ہے کہ جس باطل پر قائم ہوں تم اس میں میرے ہمنوا بنے رہو سیرت نبویؐ میں ہے کہ قریش مکہ نے بھی مال کثیر پیش کیا کہ آپؐ دعوتِ دین کے اس کام کو ترک کر دیں، جس سے معلوم ہوا کہ ہر دور میں ملاء (سربرآوردہ طبقہ) لوگوں کو مال کا لالچ دے کر راہِ حق سے باز رکھنے کی سعی کرتا ہے۔

تیسرا سبب

قوم کے سربرآوردہ لوگ عام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے صرف اپنے اقتدار کی قوت اور دولت دنیا کا لالچ دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دعوت حق کے بارے میں

لوگوں میں شکوک و شبہات بھی پھیلاتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ داعی حق مجنون ہے کبھی کہتے ہیں کہ یہ گمراہ ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ کم عقل ہے۔ چنانچہ قوم نوح اور ہود نے کہا۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔

(الاعراف : ۶۰)

"اس کی قوم کے سرداروں نے کہا ہم کو تو نظر آتا ہے تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو"

اور حضرت ہودؑ کی قوم نے کہا کہ

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ۔

(الاعراف : ۶۶)

"اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات کا انکار کر رہے تھے۔ کیا ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو"

ایک شبہہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ ہم دعوتِ حق کی اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ یہ رسول انسان ہے حالانکہ رسول کو بشر نہیں ہونا چاہیئے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا

(ھود : ۲۷)

"قوم کے سرداروں نے جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا کہا ہماری نظر میں تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے"

ایک اور شبہہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ اس دعوت کی مخالفت اس لئے ضروری ہے تاکہ لوگوں کے دین کی حفاظت کی جائے ان کی مصالح کو مدنظر رکھا جائے اور دفع فساد کیا جائے، اور یہ شبہہ ہر زمانے کا سربرآوردہ طبقہ ابھارتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ إِنِّي أَخَافُ

اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ (المومن : ۲۶)

(ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا چھوڑو مجھے اس موسیٰ کو قتل کئے دیتا ہوں اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا۔ یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔)

اسی طرح کی بات قریش نے بھی کہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے عقیدے کو خراب کر رہے ہیں اور ان کے معبودوں کی شان گھٹا رہے ہیں اس لئے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

ان کا ایک اشتباہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس دولت دنیا کی کثرت ہے اور پہلے ہی سے انہیں عزت و اقتدار حاصل ہے اس لئے وہ حق پر ہیں. اور نیکو کار ہیں اور داعی حق سے اور رسول سے بہتر ہیں۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ۔ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ۔ (الزخرف : ۵۱:۵۲)

فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکارا لوگو کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں۔ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے۔ اور اپنی بات بھی کھول کر نہیں بیان کر سکتا۔

"فرعون اپنی ملکیت اپنی دولت اور عزت و اقتدار پر فخر کرتا ہے اور عوام الناس کو یہ مغالطہ دیتا ہے کہ وہ اس مقام و مرتبہ کا موسیٰؑ سے زیادہ حقدار ہے کیونکہ موسیٰؑ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور اس قدر کمزور اللسان ہے کہ اپنے مقصد اور مدعا کی وضاحت تک نہیں کر سکتا۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۔

(سبا: ۳۴-۳۵)

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھنے والے ہیں۔ ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"

ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ جو مال و دولت اور متاع دنیا اور اولاد ان کو ملی ہے یہ اس امر کی غماز ہے کہ وہ نیکوکار ہیں اور عذاب سے رستگار بنا دیئے گئے ہیں درحقیقت سنت اللہ کو سمجھنے میں بھی انہیں مغالطہ ہوتا ہے اور یہی مغالطہ وہ عوام کو دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اللہ دیتا ہے جو اس کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے دولت و دنیا کا کسی کے پاس ہونا اس کی نیکی کی اور خدا کے راضی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

یہ شبہات ہرچند کہ باطل ہیں مگر جمہور عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر سننے والا گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ ارباب اقتدار ان شبہات کو عوام کے سامنے بڑے دل نشیں اسلوب میں اور بڑی رنگین عبارت میں بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دولت کی کشش سے اور اقتدار کی قوت سے اس فریب کاری اور گمراہی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

انسان فطرتاً خوشگوار اور پر آسائش زندگی چاہتا ہے اور اس امر کا خواستگار ہوتا ہے کہ اس کی زندگی محرومیوں اور اذیتوں کا شکار نہ ہو، ان انسانی جبلتوں کے ساتھ جب یہ شبہات جمع ہو جاتے ہیں تو اکثر جمہور اس کے زیر اثر آجاتے ہیں اور بہت کم اس سے بچ سکتے ہیں اور یہی قلیل تعداد انبیاء کرام اور داعیانِ حق کے ساتھ ہوتی ہے۔

مبحث سوم

منافقین

منافق کی تعریف

شرعی اصطلاح کے مطابق منافق وہ ہے جو اپنے دل میں کچھ رکھے اور اظہار کچھ اور کرے، اگر اس کے دل میں اصول ایمان کی تکذیب ہے تب تو وہ کافر ہے اور آخرت میں اس کا حکم کافر کا سا ہوگا بلکہ مومنین کو دھوکہ دہی کے جرم میں اس پہ کافروں سے بھی زیادہ سخت گرفت ہوگی، اسی لئے فرمایا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء : ۱۴۵)

"یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے"

اور اگر اس کے دل میں اللہ، کتاب اور رسول کا کفر نہیں ہے بلکہ کوئی معصیت ہے تو اس نفاق کے بہت سے درجے ہیں جبکہ اس مبحث میں ہم اوپر مذکور منافق خالص کا ذکر کر رہے ہیں جو ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ ایمان لے آیا ہے مگر اپنے دل کے اندر وہ اللہ کا کتاب کا اور رسول کا منکر ہے۔ بعدازاں ہم اس منافق کا بھی ذکر کریں گے جس میں منافقین کی صفات پائی جاتی ہیں اور اسے بسا اوقات ان کا احساس تک نہیں ہوتا اور اس طرح اسلامی معاشرہ میں منافقین پیدا ہو جاتے ہیں، اس بیان سے یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمان اپنی اصلاح کی جانب متوجہ ہو سکیں گے۔

نفاق کب ظاہر ہوتا ہے

جب کافر معاشرے میں دعوت الی اللہ کو نصرت اور کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگتے ہیں کفر کی قوت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اور کفار کا اقتدار ختم ہو کر مسلمان کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل ہو جاتا ہے تو منافقین کا طبقہ وجود میں آجاتا ہے جو نہ تو اہل ایمان کے ساتھ دل سے ایمان لائے ہوتے ہیں اور نہ کھلم کھلا کفر پہ قائم رہتے ہیں اور مسلمانوں کے اقتدار اور قوت سے ڈر کر بظاہر اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور دل میں کفر چھپائے رکھتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نفاق غلبہ اور اقتدار کے وقت وجود میں آتا ہے اور جب تک اقتدار کافروں کے پاس رہتا ہے اس وقت تک نفاق موجود نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت اسلام سے بغاوت اور دشمنی اختیار کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں منافقین نہیں تھے کیونکہ مسلمان بہت کمزور اور قلیل تعداد میں تھے اور ان کے پاس کوئی قوت و طاقت نہ تھی بلکہ اقتدار کے تمام سرچشموں پر کفار قریش قابض تھے لیکن جب ہجرت مدینہ کے بعد اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا اور مدینہ میں اسلام غالب قوت بن گیا اس وقت منافقین ظاہر ہوئے۔

نفاق کی اساس

مرض نفاق کی جڑ بزدلی اور کفر ہے کہ کفر اس کے دل میں پوشیدہ ہوتا ہے مگر وہ بزدلی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتا اور اسی بزدلی ھتھکڈے پن اور حقیر ہونے کی بنا پہ چھپ کر کینہ پروری کے ساتھ اور سازش کر کے حملہ کرتا ہے۔ مومنین کے سامنے آتا

ہے تو ظاہر ایمان کرتا ہے اور اپنے ہم خیال لوگوں اور منافقین میں جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور مومنین سے میں مذاق کر رہا تھا۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِہِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَہْزِءُوْنَ۔ (البقرہ : ۱۴)

"جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اور جب علیحدگی میں اپنی شیاطین سے ملتے ہیں کہتے ہیں اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔

منافق کافر سے بھی بدتر ہے

منافق کافر سے بھی بدتر اور مضرت رساں ہے کہ کفر کے ساتھ اس نے دھوکہ دہی اور فریب کاری کو بھی شامل کر لیا ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر انہیں ایذا پہنچاتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کے تنبہ کے کم ہونے کی بنا پر اس کا نقصان کافروں سے بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ کافر کے کفر میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اپنی ظاہری صورت حال سے مسلمانوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

نفاق کی علامتیں

اگرچہ نفاق کفر باطنی پر قائم ہوتا ہے اور یہ مرض اس کے دل میں مخفی ہوتا ہے مگر پھر بھی اس کی چند علامتیں ہیں وہ اگر موجود ہوں تو مسلمان کو اس پر متنبہ رہنا چاہیئے اور اس کے شر سے بچنے کی تدابیر کرنی چاہئیں، خواہ وہ منافق خالص ہوں اور ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب موجود ہو یا کیفیات ملی ہوئی ہوں اور منافقین کی بعض صفات موجود ہوں، بہرحال جن افراد میں منافقین کی صفات موجود ہوں ان سے منافقین ہی کا

سا معاملہ کیا جائے گا خواہ وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

منافق کی ان علامتوں کا بیان کتاب و سنت میں آیا ہے اور یہی علامتیں نفاق کی حقیقی علامتیں تصور ہوں گی اور حسن ادب اور اخلاق وغیرہ کی تعبیر اختیار کرنے سے ان خصائص کی حقیقت تبدیل نہیں ہو گی کیونکہ درحقیقت مسمیات کا اعتبار ہوتا ہے اور اسماء کا اعتبار نہیں ہوتا اس لئے کہ ہر شے کی جو حقیقت ہوتی ہے وہ اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور لوگوں کے نام بدل دینے سے حقیقت نہیں تبدیل ہوتی۔

اب نفاق کی علامتیں اور اس کے خصائص بیان کرتے ہیں۔

۱۔ مرض قلب

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ۔ (البقرۃ: ۱۰)

"ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں۔ اس کی پاداش میں اُن کے لئے دردناک عذاب ہے"

یہ مرض قلب ایک طرح کا بگاڑ ہے جس کی وجہ سے ادراک و ارادہ کا توازن بگڑ جاتا ہے اور یہ مریض قلب حق کو نہیں دیکھ پاتا اور اس کو سمجھ نہیں پاتا بلکہ حق کو ناپسند کرتا اور باطل کو پسند کرتا ہے، اس مریض قلب سے مسلمان افراد کو وہ اذیتیں اٹھانا پڑتی ہیں جو صحیح القلب انسان سے نہیں پہنچتی، مثلاً یہ کہ معمولی بات اس کی خواہشوں کی اکساہٹ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

وَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (الاحزاب: ۳۲)

"زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے"

نرم اور لوچ گفتگو بھی مریض قلب کے لئے بیداری خواہش کا سبب بن جاتی ہے جبکہ صحیح القلب انسان ملتفت تک نہیں ہوتا۔ جیساکہ حضرت یوسفؑ

مائل نہیں ہوئے۔

اسی طرح معمولی شبہات مریضِ قلب کے دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے لئے فتنہ بن جاتے ہیں اور اس کو اُلٹے قدموں لوٹا دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ

(الحج : ۵۳)

(" تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے اُن لوگوں کے لئے جن کے دلوں کو نفاق کا روگ لگا ہوا ہے")

منافق خالص کا مرضِ قلب بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے جبکہ وہ منافق جو اصولِ ایمانیات پر ایمان رکھتا ہو اور اس میں کچھ علاماتِ نفاق کی پائی جاتی ہوں اس مرضِ قلب سے کم متاثر ہوتا ہے۔

۲۔ فساد فی الارض

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ
أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ۔ (البقرہ: ۱۱-۱۲)

(" جب کبھی اُن سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں۔ مگر انہیں شعور نہیں ہے۔")

منافقین زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور انہیں یہ شعور تک نہیں ہوتا کہ وہ غلط روش پر چل رہے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اصلاح کر رہے ہیں حالانکہ کفر سے بڑا فساد کوئی نہیں ہے اس لئے کہ جو اللہ کی زمین میں اللہ کی نافرمانی کرے اور دوسرے انسانوں کو نافرمانی کے راستے پر لگائے وہ یقیناً سب سے بڑا مفسد ہے۔

غرض منافقین کا فساد ان کا کفر، شک، تکذیب اور اللہ رسول اور مومنین کو دھوکہ دینا ہے اور دین کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھنا اور اللہ کے دوستوں اور داعیان

حق سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔

۳۔ مؤمنین کو کم عقل سمجھنا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ : ۱۳)

" اور جب ان سے کہا جائے کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا۔ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں۔ مگر حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں۔ لیکن یہ جانتے نہیں۔

سفیہ سے مراد وہ نادان ونا واقف اور کمزور رائے شخص ہے جو نفع نقصان کا ادراک نہ کر سکے۔[1] مگر اللہ سبحانہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ درحقیقت سفیہ (کم عقل) خود یہ منافق ہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ گمراہی کیا ہے اور ہدایت کیا ہے اور معرفت کیا شے ہے اور جہالت کیا ہے۔

۴۔ جھگڑالو پن اور گناہ پر اصرار

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۔ (البقرہ : ۲۰۴، ۲۰۶)

" انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ تو زمین میں اس کی ساری دوڑ

دھوپ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے۔ کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے"

منافق زبان کو موثر کر اور دل سے کر کڑی خوبصورت باتیں کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اسلام کا اظہار اس طرح کرے کہ مومنین کو یقین آجائے اور اسی لئے وہ اللہ کو اور مؤمنین کو گواہ بناتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہی اس کے دل میں بھی ہے اور اپنی اس گفتگو میں خوب جھوٹ بولتا ہے حق سے بہت دور چلا جاتا ہے افترا باندھتا ہے اور فجور اختیار کرتا ہے

حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بولے جھوٹ بولے جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑے تو گالیاں دے۔

منافق کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ فساد پھیلائے لوگوں کے فصل اور نسل کے فوائد کو تباہ کرے اور جب اس سے کہا جائے کہ خدا سے ڈر، یہ بری باتیں اور بدگوئی چھوڑ دے، یہ فساد کی روش ترک کر دے اور اللہ کی جانب رجوع کر تو وہ اس نصیحت کے قبول کرنے سے باز رہے اور اسے غیرتِ گناہ آجائے اور وہ اپنی روش گناہ کے اظہار پر غصہ سے بے تاب ہو جائے۔

۵۔ کافروں سے دوستی اور مؤمنین سے برسرپیکار

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ ۔۔

يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ
إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ إِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكٰفِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۔
الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ
وَإِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ
الْمُؤْمِنِينَ ۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِينَ
عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۔ (النساء: ۱۳۸، ۱۴۱)

"جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں۔ حالانکہ عزت تو ساری اللہ ہی کے لئے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے۔ کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے۔ اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی ان ہی کی طرح ہو۔ یقین جانو اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے۔ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ اگر کافروں کا پلا بھاری رہا تو ان سے کہیں گے۔ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے کے قابل نہ تھے۔ اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا۔ پس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا۔ اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب کرنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی"

منافق کا تعلق اور ان کی دوستی کافروں کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ درحقیقت انہی میں سے ہوتا ہے اور مسلمانوں کی حکومت کے زوال اور کفار کے ان پر غالب آجانے اور دین اسلام کے ختم ہو جانے کا منتظر رہتا ہے لیکن اگر اس معرکۂ حق و باطل میں مسلمان کامیاب ہو جائیں تو انہیں کہتا ہے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے اور اگر کافر غالب آجائیں تو ان سے

کہتا ہے کہ دل سے ہم تمہارے ہی مددگار رہے۔

غرض اگرچہ منافقین کا حقیقی میلان کافروں کی طرف ہوتا ہے لیکن عملاً وہ دونوں کو خوش رکھنے کی سعی کرتے ہیں تاکہ اس معرکہ کی آزمائشوں سے نہ گزرنا پڑے اور جب مشرکین اور کافرین کو غلبہ ہو تب علی الاعلان ان کے ساتھ ہو جائیں۔

۶۔ فریب دہی ریاکاری اور عبادات میں سستی

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى ھٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا۔ (النساء ۱۴۲، ۱۴۳)

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اللہ نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، جب یہ نماز کے لئے اُٹھتے ہیں۔ تو کسمسائے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اُٹھتے ہیں۔ اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر وایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔

منافقین کی ایک اور خصوصیت فریب دہی ہے یہ خدا کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور انسانوں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی صورت یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح معاشرے میں وہ مسلمان سمجھے جا رہے ہیں اور ان پر احکام اسلام جاری ہو رہے ہیں اسی طرح وہ خدا کے یہاں بھی مومنین میں شمار کر لئے جائیں گے اور جس طرح ان کی حقیقت لوگوں سے مخفی رہی ہے اسی طرح خدا سے بھی مخفی رہے گی لیکن یہ محض جہالت ہے اس لئے کہ کائنات کی کوئی بھی شے اللہ سے مخفی نہیں ہے۔

ان کی ایک اور خصوصیت ان کا عبادات کو بوجھل محسوس کرنا ہے کہ جب لوگ انہیں نماز یاد دلاتے ہیں تو بڑی سستی اور کاہلی سے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نماز ان کا مطلوب نہیں ہے بلکہ لوگوں کو دکھانا مقصود ہے اور اسی وجہ سے وہ اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ جب دیکھا کہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان آگیا ہے تو چار ٹھونگے مار لئے۔

غرض منافقین حیرت میں رہتے ہیں نہ وہ ظاہراً اور باطناً مومنین کے ساتھ ہوتے ہیں اور نہ کھل کر مشرکین کے ساتھ ہوتے ہیں۔

۷۔ طاغوتی فیصلہ قبول کرنا

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ آمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلَالًا بَعِیْدًا ○ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا ○ فَکَیْفَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ ثُمَّ جَآءُوْکَ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰہُ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ وَقُلْ لَّھُمْ فِیْ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا ○

(النساء ۶۰، ۶۳)

(اے نبیؐ) تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی۔ اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئیں تھیں۔ مگر چاہتے ہیں کہ

اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے دور لے جانا چاہتا ہے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اُس وقت کیا ہوتا ہے۔ جب ان سے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے۔ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے۔ ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔ اللہ جانتا ہے۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان سے تعرض مت کرو۔ انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے"

منافقین کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اس اظہار کے باوجود کہ وہ ان احکام پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے آپؐ پر اور آپ سے پہلے رسولوں پر نازل کئے ہیں لیکن اپنے معاملات زندگی میں وہ طاغوت اور باطل کا فیصلہ چاہتے ہیں اور کتاب وسنت کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، جبکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ طاغوت سے اور باطل سے برأت کا اظہار کرو اور جب ان پر نفاق کی وجہ سے اور اللہ کے احکام سے سرکشی کی وجہ سے جب وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آپ کے پاس آکر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ حسن عمل اصلاح اور خیر ہی تھا۔

اللہ خوب جانتا ہے کہ اللہ کے دین سے اور اس کی شریعت سے کنارہ کشی کرنے والوں کے دلوں میں کیا بیماری ہے، تو آپؐ ان سے اعراض کیجئے، ان سے سختی نہ کیجئے بلکہ ان کو اس مرض نفاق سے روکئے اور بہت اچھے طریقہ پر انہیں نصیحت کیجئے۔

۸۔ مومنین کے مابین فساد

لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ۔

(التوبہ: ۴۷)

"اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

منافقین کمزور مومنین میں داخل ہو کر ان میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت سے ان کی پوری کیفیت کی وضاحت ہوتی ہے، کہ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ منافقین پورے اخلاص کے ساتھ ان کے ساتھ آئیں اور ان کے ساتھ تبلیغِ حق اور جہاد میں مصروف ہوں اور ان کی عدم شمولیت پر مؤمنین کو غم و رنج ہوتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ ساتھ ہوتے تو بہتر ہوتا۔

مگر اللہ جانتا ہے کہ اگر یہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے تو چغلخوری کرتے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے اور ان میں فتنہ پیدا کرنے کی سعی کرتے، جبکہ خود سچے مسلمانوں میں ان کی باتوں پر کان دھرنے والے ان کی اطاعت کرنے والے ان کے کلام کو سننے والے اور ان سے مشورہ لینے والے موجود ہیں کیونکہ ان کو ان کی حالت کا علم نہیں ہے جس سے مومنین کے مابین شر برانگیختہ ہو جائے گا۔[1]

۹۔ جھوٹ خوف اور مسلمانوں کو ناپسند کرنا

وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ۔

(التوبۃ: ۵۶، ۵۷)

"وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ کہ ہم تم ہی میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں۔ جو تم سے خوف زدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جاہ پناہ پائیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔"

منافقین کی خصوصیت جھوٹ بولنا اور جھوٹا حلف اٹھانا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ

منافقین کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور امانت میں خیانت کرے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ

'جب جھگڑے تو گالیاں دے'۔

آیت مذکورہ میں بتایا گیا ہے کہ منافقین اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے اور اس جھوٹے حلف اٹھانے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں ان کا کفر ظاہر نہ ہو جائے اور مسلمان ان سے بازپرس نہ کریں۔ چونکہ یہ منافقین مسلمانوں کو اور اسلام کو ناپسند کرتے ہیں اس لئے مسلمانوں سے میل جول پسند نہیں کرتے اور اسلام کی عزت اور غلبہ پر ان کو افسوس ہوتا ہے اس قدر زیادہ کہ اگر انہیں کوئی قلعہ یا پناہ گاہ، یا زمین کے اندر کوئی سرنگ یا غار میسر آجائے تو وہ بھاگ کر اس میں پناہ لے لیں اور اس طرح مسلمانوں کے دیکھنے سے اپنے آپ کو بچالیں۔

۱۰۔ اہل حق کو عیب لگانا اور اپنی ذات کی خاطر خوش ہونا یا ناراض ہونا

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقَاتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ۔ (التوبہ : ۵۸)

"اُن میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے۔ تو خوش ہو جائیں۔ اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں"

منافقین کی ایک اور علامت اہل حق پر الزام عائد کرنا اور ان کے اعمال کو برا

کہنا ہے کیونکہ وہ فی الواقع حق اور عدل کو پسند نہیں کرتے اور ان کی رضامندی اور ناراضگی محض اپنی ذات کی خاطر ہوتی ہے کہ اگر جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ انہیں مل جائے تو وہ راضی ہو جائیں اور اگر ان کو ان کی مطلوبہ مراد نہ ملے تو وہ ناراض ہوں اور برہم ہوں اور اہل حق پر ظلم و جفا کا الزام لگائیں۔ منافقین نے سرکار دو عالمؐ کے ساتھ ایسا ہی کیا جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ منافقین کا ایک گروہ تھا جو زکوٰۃ کے مستحقین کے مابین تقسیم میں الزام لگاتا اگر انہیں کچھ مل جاتا تو راضی ہو جاتے اور خاموش ہو جاتے اور نہ ملتا تو ناراض ہوتے اور غصہ کا اظہار کرتے۔ اور ہر دور کے منافقین کا یہی رویہ رہا ہے کہ اگر انہیں کچھ مل جائے تو راضی ہو جاتے ہیں ورنہ ناراض، یعنی حق و عدل کے بجائے ان کا مطمع نظر ان کی ذات ہوتی ہے۔

۱۱۔ برائی کا حکم دینا اور نیکی سے روکنا

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ أَيْدِيَهُمْ ط نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ط إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ ؛ (التوبہ : ۶۷)

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے۔ تو اللہ بھی ان کو بھول گیا یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں"

منافقین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ برائیوں کا حکم دیتے اور اچھائیوں سے لوگوں کو روکتے ہیں اور انہیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ نیکیاں کریں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ برائیوں کی اشاعت ہو اور منکر پھیلے اور وہ اور دوسرے تمام لوگ برے کاموں میں برابر ہو جائیں اور اسی بری خصلت کی وجہ سے وہ اللہ کی رضا کے کاموں میں

اپنا مال خرچ نہیں کرتے اور نیکی کے راستے میں مال خرچ کرنے اور عمل صالح کرنے میں بخل کرتے ہیں بلکہ عمل خیر کی نشاندہی اور اس کے حکم میں بھی بخل کرتے ہیں۔

۱۲۔ عہد شکنی

وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ ٥ فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُعْرِضُوْنَ ٥ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ٥ (التوبۃ: ۷۵-۷۷)

"ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے نوازا تو ہم خیرات کریں گے۔ اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے۔ اور اپنے عہد پر سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پروا تک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے ان کی پیشی کے دن تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔"

منافقین کی ایک اور علامت یہ ہے کہ وہ عہد شکنی، خیانت اور بدعہدی کے مرتکب ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ اللہ سے بھی عہد کر کے توڑ ڈالتے ہیں، جبکہ مومن عہد شکنی خیانت اور بدعہدی کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو بھی پورا کرتا ہے اور انسانوں سے کیے ہوئے عہد کو بھی نبھاتا ہے۔

منافق خدا سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر خدا نے اپنے فضل سے اسے دیا تو وہ اپنے مال میں سے صدقہ کرے گا اور نیکوکار بن جائے گا، لیکن وہ اپنے اس عہد کو پورا نہیں کرتا اور اس کی اس روش سے نفاق اس کے دل میں گھر کر لیتا ہے

اور اس وقت تک یہ نفاق اس کے دل میں موجود رہے گا جب تک وہ خدا کے حضور پیش نہیں ہو جائے گا[1]

۱۳۔ مومنین پر الزام تراشی اور ان سے مذاق

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (التوبۃ۔ ۷۹)

"(جو برضا ورغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور ان کے لئے دردناک سزا ہے)"

منافق ہمیشہ مومنین پر الزام عائد کرتا ہے اور ان کی کوئی بات اسے پسند نہیں آتی، اگر مومنین مال کثیر کا صدقہ کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ریاکاری کر رہے ہیں اور اگر کم کریں تو کہتے ہیں کہ تمھاری کچھ نہیں تو صدقہ کہاں سے کرتے اور اللہ ان کے اس صدقہ سے بے نیاز ہے اور اس کے ساتھ ہی مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان سے تمسخر کرتے ہیں۔

۱۴۔ ترک جہاد کی نصیحت

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ

---

[1]: تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۱۷۳۔ تفسیر القرطبی، ج ۸ ص ۲۱۰

وَكَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ۔ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا۔ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ۔

(التوبہ ۸۱)

"جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ اللہ کے رسول کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے۔ اور انہیں گوارا نہ ہوا۔ کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اس سخت گرمی میں نہ نکلو ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔"

منافق کی ایک خصوصیت اس کی ناواقفیت اور نادانی ہے اور یہ کہ وہ ایمان باللہ کو چھوڑ کر اور جہاد کو ترک کر کے خوش ہوتا ہے بلکہ دوسرے منافقین کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے کہ اس گرمی میں جہاد کو نہ نکلو اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ آتش جہنم اس سے بھی زیادہ گرم ہوگی اور عقلمند وہ ہے جو اس سے رستگاری کے لئے عمل کرے۔

۱۵۔ عمل خیر کے پردے میں مسلمانوں کی ایذارسانی

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔

(التوبۃ: ۱۰۷، ۱۰۸)

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لئے کہ نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں۔ جو اس سے

پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے۔ کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے۔ کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس کی عمارت میں کھڑے نہ ہونا جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی۔ وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ تم اُس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکوں کو پسند کرتا ہے۔"

عہدِ نبوتؐ میں لبعض منافقین نے مسجد قبا کے مومنین کو تنگ کرنے کے لئے مسجد ضرار بنالی تاکہ وہاں نبی کریم کی رسالت کا انکار کریں اور اللہ کے اور رسول کے دشمن وہاں جمع ہوں، یہ ان کی نیت تھی اور قسمیں انہوں نے یہ کھائیں کہ ہم نے حسن نیت سے مسجد بنائی ہے تاکہ بیمار اور معذور مسلمان اس میں نماز پڑھ سکیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ اپنے اس حلف میں جھوٹے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو گرا دینے کا حکم فرمایا اور اس میں نماز نہیں پڑھی گئی جبکہ مسجد قبا کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کی تاسیس تقوی پر اور اللہ کی رضا کی طلب پر ہوئی ہے اور اسی میں مسلمانوں کو جمع ہونا چاہیئے اور نماز پڑھنی چاہیئے۔

مسجد ضرار کی طرز کی مسجدیں آج بھی مختلف صورتوں میں موجود ہیں جو دشمن اسلام اس لئے قائم کرتے ہیں کہ اس ظاہری پردے میں اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اس دین کو نشانہ بنائیں .... اسی طرز پر آج کل ادارے اور تنظیمات قائم ہوتی ہیں جو اپنی تحقیقات اور کتب و رسائل اسلام کے موضوع پر شائع کرتے ہیں اور درون خانہ اسلام کی بیخ کنی میں لگے ہوئے ہوتے ہیں .... ہم پر لازم ہے کہ ہم مختلف صورتوں میں موجود ان مساجد ضرار کو بے نقاب کریں اور ان کے پس پردہ موجود حقیقت کو واضح کریں اور اس معاملہ میں ہمارے پاس حضورؐ کی مسجد ضرار کی سنت موجود ہے۔[۱]

---

[۱]: فی ظلال القرآن، ج ۱۱، ص ۳۵-۳۶۔

مبحث چہارم

عاصی مُومنین

عاصی (گنہگار) مُومنین وہ ہیں جو اصلاً مُومن ہوں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کئے ہوئے ہوں لیکن اس شہادت کے حقوق ادا نہ کرتے ہوں اور بعض شرعی اوامر کی خلاف ورزی اور بعض نواہی کا ارتکاب کرتے ہوں۔

عاصی مُومنین کے بہت سے درجے ہیں کہ کوئی زیادہ عصیان کی روش پر چل رہا ہو اور کوئی کم معاصی کا ارتکاب کرتا ہو۔

مسلم معصیت سے معصوم نہیں ہے

مسلم معصیت سے معصوم (محفوظ) نہیں ہوتا چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر ابن آدم خطا کار ہے اور بہتر خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی نفس اطاعت کے قابل ہے اور معصیت کے بھی اور مطلوب یہ ہے کہ اطاعت کی سعی کی جائے اور معصیت سے اجتناب کرے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا ہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا ہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰاهَا ہ
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰاهَا ہ (الشمس : ۷ ، ۱۰)

(اور نفس انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اُس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اُس پر الہام کردی۔ یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے تزکیہ نفس کیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اسے دبا دیا)

اور جب مُومن گرفتار معصیت ہوجائے تو فوراً توبہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے رب کی جانب متوجہ ہو اور انابت الی اللہ اختیار کرے۔

معصیت کے اسباب

ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جو شخص اللہ پر رسول پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اسے معلوم ہو کہ معصیت خدا کی ناراضگی اور غضب کا باعث بنتی ہے تو وہ اس کے باوجود کس طرح مرتکب معصیت ہو جاتا ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان مومن کے دل میں کبھی اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ اس پر خواہش نفس اور شیطان کی تاثیر غالب آجاتی ہے اور وہ گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے کیونکہ گناہوں پر سزا آخرت میں مرتب ہو گی اور دنیا کی جن لذتوں پہ پابندی ہے وہ اب سامنے موجود ہیں اور نفس کی جبلت یہ ہے کہ وہ حاضر سے متاثر ہوتا ہے غائب سے نہیں ہوتا اگرچہ اس حاضر کا انجام برا ہو اور غائب کا مال بہتر ہو، نفس کے اس طرح متاثر ہو جانے سے وہ قوی ایمان بچا سکتا ہے جو اس قدر قوی ہو کہ غائب کو حاضر کے درجے میں بنا دے اور مومن اس غائب سے متاثر ہو مگر اس حاضر موجود کا تاثر قبول نہ کرے۔ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

"(یعنی انسان طبعاً لذتِ عاجلہ سے اور فائدہ موجود سے متاثر ہوتا ہے) اگرچہ وہ آخرت کی لذت اور آخرت کی منفعت کے بالمقابل بالکل حقیر ہو اور جس قدر ایمان کمزور ہوتا جاتا ہے یہ جبلت قوی ہوتی جاتی ہے اور فوری لذت اور منفعت کے حصول کی خاطر ارتکاب معصیت آسان ہو جاتا اور فوری مشقت سے گریز گناہ کو سہل بنا دیتا ہے بالخصوص جبکہ دل میں یہ بات بھی ہو کہ توبہ کر لیں گے اور اللہ بڑا غفور رحیم ہے وہ معاف فرما دے گا۔

عاصی کی جہالت

عاصی (گنہگار) جاہل ہوتا ہے، اگر وہ اس نادانی کا مرتکب نہ ہو تو ارتکاب

گناہ بھی نہ کرے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (النساء: ۱۷)

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ کا توبہ کی قبولیت کا حق اُن ہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گذرتے ہیں۔ اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور دانا ہے۔"

مجاہد اور دیگر اصحاب علم سے منقول ہے کہ جو بھی شخص عمداً یا خطأً ارتکاب گناہ کرے وہ جاہل ہے جب تک گناہ کی اس گرفت سے نکل نہ جائے۔

قتادہ نے حضرت ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان فرماتے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ بندہ جو گناہ کرے وہ جہالت ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں مرتکب معصیت گناہ کے عمل کے وقت جاہل ہوتا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ برائی کا ارتکاب ہی جہالت ہے۔[1]

عاصی کی جہالت کی وجہ یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت سے نا آشنا ہوتا ہے اسے نہیں معلوم ہوتا کہ اسے اپنے رب کی کس طرح اطاعت کرنا چاہیئے اور اپنے رب کی الوہیت اور اس کی نعمتوں کا کس طرح اعتراف کرنا چاہیئے اور کس طرح اللہ سبحانہ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا چاہیئے اور اسے یہ نہیں معلوم کہ اللہ تو ہر شے سے باخبر ہے اور انسانوں کو ان کے اعمال کا ضرور بدلہ ملے گا اور گناہ انسان کے لئے آخرت میں بے حد ضرر رساں ثابت ہوں گے اور گناہوں سے اس طرح ڈرنا چاہیئے جس طرح انسان سانپ بچھو سے ڈرتا ہے۔ مگر عاصی ان تمام امور سے ناواقف ہونے کی بنا پر یا ان سے غفلت کی بنا پر ارتکاب گناہ کر لیتا ہے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دے دیتا ہے حالانکہ

دنیا کی نعمتوں کو اخروی نعمتوں کے مقابلے میں بس اتنی حیثیت ہے جتنی سمندر میں انگلی ڈالنے سے انگلی پانی سے تر ہوتی ہے۔ نیز اسی جہالت کی بنا پر گنہگار توبہ میں تاخیر کرتا ہے امیدیں باندھتا رہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ موت انسان سے اس قدر قریب ہے جتنا جوتے کا تسمہ جوتے کے قریب ہوتا ہے اور جب موت آجائے گی تو اسے ذرا بھی مہلت نہیں ملے گی۔

عاصی کی جہالت اور نادانی یہ ہے کہ وہ تھوڑی سی دنیاوی منفعت کے لئے اپنا آرام و راحت قربان کردیتا ہے اور خوب محنت و کوشش کرتا ہے اگر اسے آخرت کی فکر ہو تو وہ اس کے لئے بھی اسی طرح کوشش کرے۔

ایک طالب علم امتحان کی تیاری کی خاطر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتا ہے اور اپنی بہت سی دلچسپیاں ترک کردیتا ہے تاکہ اسے امتحان میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

تاجر بہت سے خطرات برداشت کرتا گھر بار کو ترک کردیتا ہے اور محنت ومشقت میں لگا رہتا ہے تاکہ تھوڑا سا مال حاصل کرلے۔ لیکن یہ سب آخرت کے لئے اسی طرح جدوجہد کیوں نہیں کرتے جس طرح کہ دنیا کے لئے کرتے ہیں۔

ایک طبیب اگر بتاتا ہے کہ مریض فلاں شے کھائے گا تو مر جائے گا یا اس کے مرض میں اضافہ ہو جائے گا تو مریض طبیب کی ہدایت پر عمل کرتا ہے اور ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہے جن سے اسے طبیب نے منع کیا ہے حالانکہ خود طبیب کی تشخیص میں غلطی کا احتمال موجود ہے۔ جبکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یقینی طور پہ اور مکمل صدق کے ساتھ بتایا ہے کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرے گا اور اللہ کی حدود کو توڑے گا اس پہ روز قیامت یہ عذاب ہوگا تو اگر ایک شخص طبیب کا قول تسلیم کر لیتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پہ یقین نہیں کرتا تو وہ اس کی جہالت ہی ہے۔

اللہ کی رحمت اور عفو پہ تکیہ کر لینا اور یہ بات بھول جانا کہ اللہ کی رحمت احسان کاروں کے قریب ہے بجائے خود نادانی ہے کیونکہ عارف (دانا) تو عمل صالح بھی اس خشیت کے ساتھ کرتا ہے کہ کہیں غیر مقبول نہ ہو جائے اور اعمال صالحہ کر کے رحمت کا طلب گار ہوتا ہے جیسے کوئی شخص زمین کو تیار کرے اس میں بیج ڈالے، پانی دے اور اللہ سے توقع رکھے کہ اللہ اپنی رحمت سے اس کی فصل کو ہر آفت سے محفوظ رکھے گا اس کے برعکس اگر کوئی شخص گھر بیٹھا رہے اور کانٹوں بھری زمین سے یہ امید رکھے کہ اللہ اس میں پیداوار کر دے گا تو یہ نادانی اور حماقت ہے۔

معاصی سے اجتناب

اگرچہ معاصی کے ارتکاب اور ان کی جانب میلان کے بارے میں ہم کچھ بیان کر چکے ہیں اور اس کی مزید تفصیل ہم چوتھے باب دعوت کے طریقوں میں بیان کریں، لیکن ہم یہاں پہ اتنا ذکر کرتے ہیں کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے اور یہ اصول جس طرح امراض جسمانی کے لئے صحیح ہے اسی طرح امراض قلب کے لئے بھی صحیح ہے کیونکہ معصیت کا سبب مرض قلب ہے اور معاصی اسی مرض کے نتائج ہوتے ہیں۔

ہر نفس میں معاصی کے ارتکاب کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس: ۸-۷)

"نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کے بدی اور پرہیزگاری اُن پر الہام کردی۔"

ہر نفس میں معاصی کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور اگر قلب کی حالت صحیح اور صحت مند ہو اور قلب میں ایمان قوی موجود ہو تو یہ جراثیم کمزور ہو جاتے ہیں اور اپنے اثرات مرتب نہیں کر سکتے، لیکن اگر ایمان قلب کسی وجہ سے کمزور ہو جائے تو ان جراثیم کو بڑھنے نشوونما پانے اور اپنی فعالیت ظاہر کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں جیسا کہ جسم کے جراثیم موزوں ماحول میں طاقتور ہو جاتے ہیں۔

معاصی کے جراثیم کے لئے معصیت کی خواہش پیدا کرنے والے تمام سماعی، محسوس اور مسموع امور موزوں ماحول فراہم کرتے ہیں اور معاصی کی امنگ پیدا کرنے والی کتابیں اور رسائل اور اسی طرح معلومات بھی موزوں ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔

معاصی کی خواہش پیدا کرنے والے یہ امور اللہ کی یاد سے غافل کر دیتے ہیں اور انسان ارتکاب معصیت کر بیٹھتا ہے۔

نیم برہنہ عورتیں، فحش گانے، حرام اختلاط، اہل غفلت کے مقامات پر جانا اور دنیا کی باتیں سنتے رہنا گناہ کا ماحول بنا دیتا ہے اور انسان معاصی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس گناہ کے ماحول کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وہ عمل اختیار کیا جائے جس سے ایمان کا مفہوم قوی ہو اور اللہ پر اور آخرت پر ایمان پختہ ہو اور آخرت کا راستہ واضح نظر آئے۔

پاکباز اور طاہر داعی اللہ کی صحبت تمہارے نفس کے لئے قلعہ اور تمہارے ایمان کے لئے پناہ گاہ بن سکتی ہے اور اس ایمان کی تقویت

ہی سے جراثیم گناہ کمزور ہوگا، نیز گناہ سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچے کہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں مل کر گٹھا بن جاتی ہیں۔ اور ان امور کی جانب متوجہ نہ ہو جن سے معصیت کا جذبہ اُبھرے اور پیدا ہو کیونکہ کوئی بھی انسان یہ نہیں چاہتا کہ وہ دق اور سل کے مراکز پہ جاتا رہے اور اسے یہ جراثیم لگ جائیں۔

گنہگاروں کے بارے میں داعی کا موقف

داعی گنہگاروں کی جانب رحمت اور شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے جیسے کوئی تاریک رات میں کسی کھائی کے کنارے کسی کو کھڑا ہوا دیکھے اور اس کے گرنے سے خوفزدہ ہو اور اس کو بچانے کے لئے جدوجہد کرے۔ داعی کسی گنہگار شخص کو برا بھلا نہ کہے اور اسے حقیر نہ سمجھے اور اپنی ذات کے لئے انتقام نہ لے البتہ اس کے گناہ کو برا سمجھے اور اس پر مناسب طریقے سے اظہار ناراضگی کرے، چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا گیا ہو، جب اللہ کی حرمت کو پامال کیا جاتا تو کوئی بات آپ کو غضب سے روکنے والی نہ ہوتی اور آپؐ اللہ کے لئے اس کی سزا جاری فرماتے، اللہ کی ان حرمتوں میں سے جن پہ داعی کو ناراض ہونا چاہیئے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص داعیانِ حق کی دشمنی اختیار کرے، دعوت کے کام سے روکے اور لوگوں کے دعوت کے قبول کرنے میں رکاوٹ بنے، ان صورتوں میں داعی ایسے طریقے اختیار کر سکتا ہے جن سے دعوت کو اور داعیانِ حق کو ان لوگوں کے شر سے بچایا جا سکے اور ساتھ ہی ان کی ہدایت کی پوری جدوجہد کرتا رہے۔

چوتھا باب

دعوت کے طریقے اور اس کے ذرائع

تمہید

دعوت کے لئے ضروری ہے کہ داعئ حق عالم دین ہو اور تبلیغ سے متعلق امور سے واقف ہو اور وقت حالات اور نفس انسانی کی صلاحیتوں سے آشنا ہو، جس قدر موضوع دعوت یعنی اسلام کے لئے علم درکار ہے اس کے بارے میں ہم گفتگو کر چکے ہیں، اور اب ہم اس علم کے بارے میں بیان کرتے ہیں جو تبلیغ کے لئے اور تبلیغ کے راستہ میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اور یہ دعوت کے وہ طریقے اور ذرائع ہیں جن کا جاننا اور بخوبی سمجھ لینا داعی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

اس اساس پر ہم اس باب کو تین فصلوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

پہلی فصل : دعوت کے طریقوں کے مآخذ اور ان کی ضرورت

دوسری فصل : دعوت کے طریقے

تیسری فصل : دعوت کے ذرائع

پہلی فصل

دعوت کے طریقے، ذرائع اور ان کی ضرورت

مصادر و ماخذ

دعوت کے طریقوں اور اس کے ذرائع کے ماخذ قرآن کریم، سنت نبوی، سیرت سلف صالح فقہاء کے استنباطات اور تجربات ہیں۔ اور ان میں سے ہم ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے۔

۱۔ قرآن کریم

قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جو کہ انبیاؑ کی اخبار اور ان کی قوموں کے واقعات و حالات کے بیان پر مشتمل ہیں۔ نیز وہ آیات بھی ہیں جن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو امور دعوت سے باخبر فرمایا گیا ہے۔

ان تمام آیات سے دعوت کے طریقوں اور اس کے ذرائع کا علم ہوتا ہے اور ضروری ہے کہ داعی مسلم اسی طرح ان کا فہم حاصل کرے جس طرح دیگر امور دین کا علم حاصل کرتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ' نے یہ واقعات اسی لئے بیان فرمائے ہیں اور یہ آیات اسی لئے ذکر فرمائی ہیں کہ ہم ان سے استفادہ کریں اور کار دعوت میں ان سے راہنمائی حاصل کریں اور قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی پابندی کریں۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ
وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (ہود: ۱۲۰)

(یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تمہیں حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔)

ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

ہم انبیاء اور رسولوں کی جو خبریں بیان کرتے ہیں اور ان کے اپنی قوموں کے ساتھ جن دلائل نزاع اور مباحثوں کا ذکر کرتے ہیں اور انبیاء نے جو تکالیف راہِ حق میں اٹھائیں اور کس طرح اللہ نے جماعت مومنین کو کامیاب کیا اور کس طرح اس کا انکار کرنے والے ناکام ہوئے یہ تمام امور ہم اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ اے محمدؐ آپ کے دل کو مضبوط کریں اور تقویت دیں اور آپؐ کے سامنے اپنے پیشرو انبیاءؑ کا ایک اسوہ ہو جائے[1]

بلاشبہ مومنین اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امور میں اقتدا کرتے ہیں اور ان امور میں بھی ان کی اقتدا کرتے ہیں جن میں آپؐ نے دعوت الی اللہ کے کاموں میں دیگر انبیاء کی اقتدا کی، چنانچہ ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا
يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (یوسف: ۱۱۱)

(اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لئے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں انہی کی تصدیق ہے۔ اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے رحمت اور ہدایت)

اقوام گذشتہ اور انبیائے سابقین کے قرآن کریم نے جو قصص و واقعات بیان کئے ہیں وہ تمام اصحاب عقل سلیم کے لئے نصیحت و عبرت اور مومنین کے لئے ہدایت و نصیحت ہیں کہ مومنین کے قلوب ایمان کی وجہ سے حق کے لئے وا ہو گئے ہیں اور عبرت اور موعظت کے مقامات سے ان کی عبرت پذیری کی صلاحیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے فرمایا اور لازمی قرار دے دیا کہ مومنین اللہ کے رسولوں کے منہاج کی اتباع کریں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ط (الانعام: ۹۰)

"وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ انہی کے راستے پر تم چلو"

۲۔ سُنت نبویؐ

سُنت نبویؐ میں متعدد احادیث ہیں اور وہ واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں جو آپؐ کو مکہ اور مدینہ منورہ میں پیش آئے اور آپؐ نے ان حالات میں کس طرح دعوت دین کا کام کیا، اس کی تمام جزئیات موجود ہیں جو دعوت کے طریقوں اور ان کے ذرائع پر کافی مواد فراہم کرتی ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف حالات سے گزرے اور وہ واقعات آپؐ کو پیش آئے جو ہر زمانے میں اور ہر مقام پر داعی حق کو پیش آتے ہیں اور موضوع اور ہر مسئلہ سے متعلق مثالیں سیرت نبویؐ میں موجود ہیں جن سے داعی حق استفادہ کر سکتا ہے اور اگر اسے فقہ سنت حاصل ہو تو وہ ہر مسئلہ کے بارے میں سنت سے ایک صحیح مؤقف معلوم کر سکتا ہے۔

یہ درحقیقت اللہ سبحانہٗ کی بڑی حکمت اور مصلحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات اور واقعات سے گذرے تاکہ مسلمانوں کو معلوم

ہو جائے کہ امور دعوت میں وہ کس طرح عمل کریں اور کس طرح سنت رسولؐ کی اتباع کریں۔

اور ظاہر ہے کہ آپؐ کی سنت امور دعوت میں اور تبلیغ رسالت میں فرامین الٰہی کی تطبیق اور عملی صورت ہے اس لئے داعی حق کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہے کہ وہ سنتؐ سے انحراف اور تجاوز کرے۔

۳۔ سلف صالح کی سیرت

صحابۂ کرام اور تابعین کی سیرت میں دعوت حق کے عملی نمونے موجود ہیں اور داعی حق کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے کیونکہ صحابۂ کرام اور تابعین شارع کی مراد سے زیادہ واقف اور امور دعوت سے زیادہ آشنا تھے اس لئے ہمیشہ علماء اور فقہاء نے ان کی سیرت سے استدلال کیا ہے۔

۴۔ فقہاء کے استنباطات

فقہاء کرام دلائل شرعیہ سے احکام کا استنباط کرتے ہیں اور ان احکام میں وہ مسائل بھی آتے ہیں جو دعوت سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد اور حسبہ کے احکام۔ فقہاء نے ان احکام کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں بیان کیا ہے اور دعوت اور اس کے متعلقہ مسائل میں اپنے اجتہادات کی تشریح کی ہے تو اس لئے ان کے یہ اجتہادات بھی اسی طرح واجب العمل ہوں گے جس طرح کہ ان کے دیگر اجتہادات ہیں کیونکہ دعوت کے وسائل اور ذرائع کی بھی امور دین میں وہی حیثیت ہے جو عبادات اور معاملات کی ہے۔

۵۔ تجربہ

تجربہ انسان کا بہترین معلم ہے چنانچہ داعی حق کو بھی دعوت کے پیش کرنے میں بہت سے تجربات پیش آتے ہیں اور وہ ان تجربات کی روشنی میں اور اوپر بیان کردہ مصادر سے حاصل شدہ علم کی روشنی میں جو قدم اٹھاتا ہے وہ دعوت حق کا ایک سرمایہ ہوتا ہے کبھی اس سے تطبیق میں غلطی ہوتی ہے تو وہ مستقبل میں اس سے اجتناب کرتا ہے اور اپنے تجربات کے ساتھ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتا ہے۔ کہ حکمت مومن ہی کی متاع گم گشتہ ہے جہاں بھی پائے اسے اخذ کرلے۔

دعوت کے طریقوں اور ذرائع سے استفادہ میں صحیح منہاج کا اختیار کرنا

بہرحال دعوت کے طریقوں اور ان کے ذرائع کے مآخذ وہ ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں اور ان کی اتباع ضروری ہے کیونکہ اسلام نے اس کو لازم قرار دیا ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دین کے تمام تقاضوں کو پورا کرے اسی منہاج صحیح کی اتباع مقصود تک پہنچانے والی ہیں اگرچہ اس میں کچھ وقت لگے جبکہ اس کے علاوہ تمام مناہج منزل سے دور کرنے والے اور غلط ہیں نیز یہ کہ داعی کا مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے اور عصیان کا مرتکب نہ ہو اور داعی کا یہ مطلوب مذکورہ بالا مصادر سے حاصل شدہ طریقوں کے بروئے عمل لانے ہی سے ہو سکتا ہے۔

جب داعی اس مقصود کے لئے جدوجہد کرتا تو وہ نتیجۂ عمل کے بارے میں جواب دہ نہیں ہے بلکہ مقصود رضائے الٰہی کا حصول اور اس کے دین کی اشاعت ہوتا ہے اور اسی فریضہ کی ادائیگی پر جواب دہی ہے۔

داعیٔ حق جب دعوت کے صحیح منہاج کو سمجھ لے اور اس کے سامنے اس امر کی حقیقت واضح ہو جائے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں رہتا کہ اس راستہ کی دشواریوں اور اس راہ کی طوالت اور لوگوں کے عدم قبول کو حجت بنا کر اس صحیح منہاج سے ہٹ جائے بلکہ عمل جہاد اور شہادت فی سبیل اللہ کی سچی رغبت اور ایک دینی جذبہ کے تحت جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچنے کا کوئی اور راستہ پیدا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ حسن نیت سے ناصواب صواب نہیں بن جاتا اور کیونکہ کسی منزل کے پہنچنے کے لئے جو راستہ متعین ہے اس راستے پر چلنا لازمی ہوتا ہے خواہ راہی منزل پر جلد پہنچنے کا کتنا ہی مشتاق کیونکہ نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام کے احکام تمام ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوتے اور اسلامی دعوت نے سچے مومنین کی رغبتوں اور مخلص لوگوں کے اخلاص کی بنا پر تیز رفتاری اختیار نہیں کی بلکہ اپنی فطری رفتار پہ جاری رہی یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جہاد فرض نہیں ہوا حالانکہ بعض صحابہ کی خواہش تھی اور اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی تلقین فرمائی اسی طرح صلح حدیبیہ پر کئی صحابہ مطمئن نہ تھے حالانکہ ان کے ایمان کی سچائی اور ان کا جذبۂ شہادت اور شوق جہاد شک وشبہ سے بالا تھا کیونکہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ جان قربان کر دی جائے بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ دعوت کے صحیح منہاج پر از اول تا آخر گامزن رہا جائے کہ منزل کو لے جانیوالے صحیح راستہ پر گامزن رہنا ہی منزل تک پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا۔

اس لئے داعی کو چاہیئے کہ وہ جذبات اور نیک عزائم اور خدمتِ اسلام کے جوش سے متاثر نہ ہو اور وہی ذرائع اور وسائل اختیار کرے جو اوپر مذکورہ مصادر سے ثابت ہوں۔

جوش و جذبہ اور رغبت عمل کو صحیح اسلوب اور صحیح ذریعے میں کام میں لانا چاہیئے اور یہ صلاحیتیں غلط راہوں میں صرف نہ ہونی چاہئیں۔

صحیح منہاج سے گریز کے نتائج

ذرائع اور وسائل کے ضمن میں صحیح منہاج سے گریز دعوت کی ناکامی پر منتج ہوتا ہے اگرچہ ابتدا میں یہ خیال ہو کہ نئے طریقۂ کار سے زیادہ کامیابی حاصل ہوگی اور اگر بالفرض کامیابی حاصل بھی ہو جائے تو وہ فوراً ہی ناکامی میں بدل جاتی ہے مزید یہ کہ صحیح منہاج سے انحراف سے کارکنوں کو تکالیف پہنچتی ہیں اور کوششیں بے مقصد ضائع ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شخص غیر موزوں مسالہ سے غیر مستقیم بنیادوں پر عمارت کی تعمیر اٹھائے کہ ایسی عمارت یقیناً ساکنوں پر گر جاتی ہے۔

یہ نتائج لازمی طور پر سامنے آتے ہیں اگرچہ داعی کی نیت درست ہو اور اس کا مقصد نیک ہو کیونکہ دنیا کے نتائج اسباب پر مرتب ہوتے ہیں خواہ نیتیں کچھ بھی ہوں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ دعوت کے لئے حُسنِ خلق اور نرمی ضروری ہے اگر کوئی داعی حسن نیت کے ساتھ سخت مزاج اور درشت خو ہو تو دعوت حق سے لوگوں کو دور کر دے گا اس لئے کہ خود رسول اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ؕ

(آل عمران : ۱۵۹)

"(اگر تم تند خو اور سنگ دل ہوتے۔ تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے")

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کی اصل حقیقی اور منہاج سے ہٹ کر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ معصیت پر ہو کیونکہ دعوت کا صحیح منہاج دین کا ایک حصہ ہے اور دین کے احکام کی خلاف ورزی معصیت ہے۔

منہاج صحیح کے التزام میں صعوبت

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے صحیح منہاج کا التزام آسان کام نہیں ہے اس لئے کہ ضروری ہے کہ داعی حق تمام مفاہیم اور معانی کا احاطہ کئے ہوئے ہو تاکہ جو عمل بھی اس سے صادر ہو اس کے مطابق صادر ہو۔ بعد ازاں ان مفاہیم کو بے شمار پیش آمدہ جزئیات پر منطبق کرے جو بڑی حد تک دشوار اور مشکل کام ہے اس لئے کہ جزئیات ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں اور ان میں فرق مشکل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض مفاہیم داعی کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ داعی کے لئے ان بہت سے مفاہیم سے نئے حل دریافت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

مختلف حالات میں دعوت کے صحیح طریقہ کار کی تطبیق کے موقع پر داعی حق کی مثال ایک جرنیل کی سی ہوتی ہے کہ جس کے ذہن میں تمام جنگی چالیں، فوجی ضوابط اور اصول موجود ہوتے ہیں لیکن جب تطبیق کا مرحلہ آتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس نے ان تمام اصول و ضوابط سے خوب استفادہ کیا ہو اور در پیش صورتحال کے لئے مناسب لائحہ عمل تیار کر کے اس پر عمل کر سکے۔

بلکہ داعیٔ حق کے لحاظ سے تطبیق قائد لشکر سے بھی زیادہ دشوار امر ہے اس لئے کہ قائد لشکر کے پاس اس کے احکام کو تسلیم کرنے والے اور اس پر علی الفور عمل کرنے والے فوجی موجود ہوتے ہیں، جبکہ داعی کا مخاطب وہ عوام ہوتے ہیں جنہیں اپنے رب کا پورا علم نہیں ہوتا جو حق سے متنفر ہوتے ہیں اور دنیا کی جانب لپکنے والے ہوتے ہیں اور داعیٔ حق کے دشمن ہوتے ہیں یا کم از دعوت کو نظر انداز کر دینے والے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں ان کی حالتیں مختلف اور متنوع ہوتی ہیں اور ان میں متعدد امراض ہوتے ہیں جس کی بنا پر داعی کا کام دشوار ہو جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود داعی حق اس راستہ کو سہل بنا سکتا ہے۔

منہاج صحیح کی پابندی کے ساتھ کار دعوت کو سہل بنانا

چند امور ایسے ہیں جن سے دعوتِ حق کے صحیح منہاج کی اتباع آسان ہو جاتی ہے۔

۱۔ دعوت حق کے صحیح منہاج سے متعلق مفاہیم کو داعی اچھی طرح ذہن نشین کر لے اور ان کو بخوبی سمجھ کر ان پر غور کرے اور ان پر بار بار نظر ڈالتا رہے تاکہ وہ اس کے قلب و ذہن میں رچ بس جائیں

۲۔ داعی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے، کیونکہ تقویٰ سے قلب منور ہو جاتا ہے اور ادراک و فہم کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور حق واضح اور جلی ہو کر سامنے آ جاتا ہے اور مختلف حالات اور متنوع اشخاص کے ساتھ معاملہ کی صورت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ داعی دعوت حق کے طریقوں اور ذرائع سے واقف ہو جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے

کرنا اور اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دینا۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ صحراء میں تشریف لے جاتے اور اپنا رخسار زمین پر رکھ کر فرماتے کہ اے ابراہیمؑ کے معلم مجھے بھی علم دے۔ اور ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ ابن تیمیہؒ اکثر ایسا کرتے اور یہ دعا بار بار دھرایا کرتے تھے۔

۴۔ اپنے قلب کو مکمل طور پر ریا سے پاک کرے اور اللہ رب العالمین کے ایسا خلوص اختیار کرے کہ کسی اور جانب التفات ہی باقی نہ رہے اور لوگوں کی رضا مندی پیش نظر نہ رہے۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ داعئ حق دعوت کے منہاج سے منحرف ہو جاتا ہے اور لوگوں کی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اپنے رفقائے کار کی سہل انگاری سے متاثر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صحیح منہاج پر قائم رہنے کے لئے اخلاص بے حد ضروری ہوتا ہے اور اخلاص ایک مشکل عمل ہے کیونکہ رِیا کے جراثیم مخفی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی داعی بے خبری میں بھی رِیا میں مبتلا ہو جاتا ہے اور منہاج صحیح پر قائم رہنے کا جذبہ مجروح ہو جاتا ہے۔

دوسری فصل

دعوت کے ذرائع

تمہید

دعوتِ حق کے کامیاب ذرائع اختیار کرنے کا مدار اس امر پہ ہے کہ مخاطبین دعوت کے مرض کی تشخیص کر لی جائے اور اس کا علاج معلوم کر لیا جائے اور مخاطب دعوت کے وہ شبہات دور کر دیئے جائیں جن کی بنا پر وہ اس مرض کا احساس کرنے سے قاصر ہے اور اسے اس جانب مائل کیا جائے کہ دوا استعمال کرنے اور یہ کہ اس کے ترک کے کیا نقصانات ہیں۔ بعد ازاں جو دعوت حق پر لبیک کہیں ان کی تعلیم و تربیت کی جائے تاکہ پرانے مرض کی روک تھام ہو جائے۔

اس مضمون کو ہم آئندہ مبحث میں بیان کرتے ہیں۔

پہلا مبحث

مرض اور اس کا علاج

مرض کی تشخیص اور دوا کی تجویز

جسمانی امراض کا طبیب پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے اور اس کے بعد دوا تجویز کرتا ہے اور یہی علاج کا صحیح طریقہ ہے۔ داعیٔ حق بھی قلوب اور ارواح کا طبیب ہوتا ہے اور وہ بھی علاج روح کا یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے اور پھر علاج تجویز کرتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی روحانی بیماری کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے

انسانیت کا مرض اور اس کا علاج

بنی نوعِ انسان کی روحانی بیماری ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور وہ ہے انسان کا اپنے رب سے غافل و ناواقف ہونا، اس سے کفر کرنا اور کاملاً اس کی عبودیت قبول کرنے سے انکار کرنا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء سابقین جو دین حق لے کر آئے ہیں اس کے برخلاف چلنا، دنیا میں منہمک رہنا، آخرت سے غفلت برتنا اور اس کا انکار کرنا۔

یہ تمام اس بیماری کی خصوصیات ہیں اور ان کے ساتھ اللہ کا انکار بھی

جمع ہو جاتا ہے اور کبھی یہ خصوصیات مرض موجود ہوتی ہے لیکن اللہ پر ایمان بھی ہوتا ہے جیسا کہ کمزور مسلمانوں میں یہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

جب یہ بیماری اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہوتی ہے تو اس کا شر اور فساد بھی اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہوتا ہے اور اگر بعض خصوصیات موجود ہوتی ہیں تو انہی کی موجودگی کے بقدر فساد اور برائی موجود ہوتی ہے۔

اس بیماری کا اصل علاج ایمان باللہ ہے کہ اللہ ہی کو رب اور الٰہ مانا جائے اور طاغوت کی جملہ انواع اور اس کے تمام مظاہر سے انکار کر کے اور دنیا کی جانب میلان کو ختم کر کے ایک خدائے واحد کی جانب متوجہ ہوا جائے۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ حضرت نوحؑ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (الاعراف ۵۹)

(ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں")

اسی طرح جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش سے فرمایا تھا جب انہوں نے حضرت ابو طالب کے پاس آ کر استفسار کیا تھا کہ محمدؐ کیا چاہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس کے ماسوا جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو ان سب کو چھوڑ دو۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو اسی امر کی دعوت دی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ (النحل : ۳۶)

(ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا ہے۔ اور اس کے ذریعے سب کو

خبردار کر دیا ہے۔ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"

عقیدہ اسلامی کو ذہن نشین کرانا

اصل بیماری اور اصل دوا کی وضاحت کے بعد داعی الی اللہ کا یہ فرض ہے کہ وہ عقیدۂ اسلامی کو لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں کرے کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہی اس بیماری کا علاج حقیقی ہے۔ اس سلسلے میں داعئ حق کو چاہئیے کہ لوگوں کو اللہ پر ایمان کا مفہوم بتائے کہ اللہ ہی تمام کائنات کا رب ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول ہیں، مرنے کے بعد کی زندگی برحق ہے اور عذاب آخرت سے رستگاری کا واحد ذریعہ عمل صالح ہے۔

غرض داعئ حق کی دعوت کی اساس عقیدہ اسلامی اور اس کے اصول و مفاہیم کی توضیح اور اس کے متعلقہ امور کی تشریح ہونی چاہئیے اور اس سے بالکل غافل نہ ہونا چاہئیے کہ یہی اصل ہے اور باقی تمام امور فروغ ہیں۔

جب یہ اصل حقیقت مخاطبین دعوت کے ذہن نشین ہو جائے اور وہ کفر کو ترک کر کے اس توحید پر لبیک کہہ لیں تو اس کے بعد ان کو اسلام کی دیگر تعلیمات سے روشناس کرانا سہل ہوگا، لیکن اگر وہ اصل حقیقت کو ہی تسلیم نہ کریں تو وہ تمام تعلیمات کے انکار پر منتج ہوگا۔

یہی صحیح طریقۂ کار ہے اسی کی قرآن کریم نے نشاندہی کی ہے اور اسی پر حضرت محمدؐ نے عمل فرمایا ہے کیونکہ مکی آیات قرآن نے اصول عقیدہ کو بیان کیا ہے اور ایمان باللہ، اللہ کی توحید، ربوبیت اور الوہیت، یوم حساب پر ایمان اور جنت و دوزخ پر ایمان کی توضیح کی ہے اور اس امر کو بیان کیا ہے کہ اخروی نجات کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور عمل صالح کی زندگی اولین شرط ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (الانعام: ۱۴-۱۷)

"کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کوئی اور اپنا سرپرست بنا لوں۔ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے جو روزی دیتا ہے۔ روزی لیتا نہیں ہے۔ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے۔ کہ سب سے پہلے میں اس کے سر تسلیم خم کر دوں۔ تو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔ تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے"

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ○
(الحج: ۵-۷)

(اے لوگو اگر تم کو زندگی بعدِ موت کے بارے میں شک ہو تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر خون کے لوتھڑے سے۔ پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے۔ اور بے شکل بھی۔ تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقتِ مقررہ تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہوئی ہے۔ پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا۔ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی۔ اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا۔ جو قبروں میں جا چکے ہیں)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (النحل: ۹۷)

" (جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اسے ہم دُنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔ اور ایسے لوگوں کو اُن کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشے جائیں۔)"

قرآن کریم ہجرت کے بعد تک اسی طرح ایمانیات اور عقیدہ کو بیان کرتا رہا اور اس کی توضیح کرتا رہا بلکہ مدنی دور میں آیات احکام کا جب نزول شروع ہوا تو ان کا اختتام بھی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ پر کیا جاتا اور اس طرح اعمال اور ایمان کے ارتباط کو مستحکم کر دیا جاتا۔

غرض داعیٔ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ دعوت میں ایمان و عقیدہ کو

اولین اہمیت دے اور ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو بتائے کہ شرعی احکام کی خلاف ورزی اور اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی ایمان کی کمزوری کا سبب ہے اور اسی ایمان کی کمزوری کی بنا پر احکام شریعت کی تعمیل دشوار معلوم ہوتی ہے اور انسان گمراہی کے راستوں پر چل پڑتا ہے۔ بلکہ جن مسلمانوں کا ضعف ایمانی ظاہر نہ ہو اور جو کھلی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوتے ہوں ان کے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ انہیں ایمان اور عقیدہ کی تبلیغ کی جائے کیونکہ اس سے ایمان میں پختگی پیدا ہوگی اور عقیدہ کا یہ رسوخ انہیں راہ حق سے منحرف ہونے سے محفوظ رکھے گا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء نے جب اپنی اقوام کو دعوت حق دی تو ان کے بعض مفاسد پر انہیں متنبہ کیا، جیسا کہ حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دعوتِ حق میں اولین بیان و توضیح عقیدہ اور ایمان کی نہیں ہوتی بلکہ ان معائب پر پہلے متنبہ کیا جاتا ہے جس میں مخاطب دعوت قوم مبتلا ہوتی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ عقیدہ اور ایمان کی تاکید کے معنی یہ ہیں کہ عقیدہ اور ایمان کو قلوب میں راسخ کیا جائے اور اس ایمان سے مربوط کر کے انہیں بداعمالیوں پر متنبہ کیا جائے، یہ مقصود نہیں ہے کہ داعیٔ حق معاشرے کی برائیوں اور معائب کو نظر انداز کر دے۔

چنانچہ قرآن کریم نے حضرت لوطؑ کی دعوت حق کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ

اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝ وَمَاۤ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۔

(الشعراء : ۱۶۰-۱۶۶)

"لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو کہ جب اُن کے بھائی لوطؑ نے اُن سے کہا تھا۔ کیا تم ڈرتے نہیں۔ میں تمہاری طرف ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العلمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں سے تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے۔ اُسے چھوڑ دیتے ہو بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گذر گئے ہو۔"

حضرت لوطؑ نے آغاز دعوت اللہ کے تقوی کی تلقین اور اپنی رسالت کا اعلان سے فرمائی اور یہ تعلیم دی کہ رسول اللہ، خدا کی عبادت کے جو طریقے بیان کرے اس میں اس کی اتباع کی جائے اور اس کے بعد انھوں نے اپنی قوم کو ان کے معائب پر متنبہ کیا۔

حضرت شعیبؑ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ (الاعراف : ۸۵)

"اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آ چکی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانہ پورا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اگر تم واقعی مومن ہو۔"

حضرت شعیبؑ نے صرف ایک خدا کی عبادت کی تلقین فرمائی اور

بتایا کہ وہ واضح حق لے کر آئے ہیں اور اس حق کا تقاضا ہے کہ ناپ تول میں حق وانصاف کریں اور لوگوں پہ ظلم نہ کریں اور زمین میں فساد نہ پھیلائیں۔ اور یہ کہ اگر وہ اللہ پہ اور اس کے رسول پہ ایمان رکھتے ہیں تو یہ تمام تعلیمات ان کے لئے خیر ہی خیر ہیں۔

غرض حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اولین تلقین یہی فرمائی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، بعد ازاں انہوں نے اپنی قوم کی سرکشی اور خدا کی نافرمانی کے بعض نتائج بیان کئے اور ان کی لواطت اور کم تولنے کی بداعمالیوں پہ متنبہ کیا۔

کم تولنے والوں کے بارے میں مکہ مکرمہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۔ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۔ أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

(المطففین : ۱-۴)

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لئے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں۔ تو پورا پورا لیتے ہیں اور ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں۔ تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے ایک بڑے دن پہ اُٹھا کر لائے جائیں گے۔ اُس دن جب کہ سب لوگ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

اس آیت میں بھی کم تولنے کے عیب کو اصل عقیدہ یعنی یوم حساب اور لوگوں کے رب العلمین کے سامنے پیش ہونے کے عقیدے سے مربوط کر کے بیان کیا گیا ہے۔

داعیِ حق کا صحیح منہاج سے دُور ہو جانا

داعی حق کبھی کبھی منہاج صحیح سے دور ہو جاتا ہے اور عقیدہ سے

متعلق امور کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ خود بھی انہی امور و مسائل پر غور و فکر میں مصروف ہو جاتا ہے جس میں لوگ مصروف ہوتے ہیں مثلاً داعی حق سیاست کے جھگڑوں میں پھنس جاتا ہے اور معاملات و امور کی تحلیل عقیدہ کے بجائے دیگر امور سے کرنے لگتا ہے اور اس کا مقصد یا تو خود اپنے مفادات کی تکمیل ہوتی ہے یا لوگوں کے جذبات و رغبات کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ اسلوب غلط ہے اس لئے کہ داعی حق کوئی ایسی نئی بات پیش نہیں کرتا جسے لوگ پہلے سے جانتے نہ ہوں بلکہ وہ اس کی آراء اور خیالات کو زیر بحث لاتے ہیں اور مباحثہ کرتے ہیں جس سے داعی حق اصل بیماری اور اس کے علاج کے مقصد سے دور ہٹ جاتا ہے اور ایمان کو لوگوں کے دلوں میں مرتکز کر دینے اور عقیدے کے نفس میں جاگزیں کر دینے کا کام رہ جاتا ہے اور مرض کی اصلاح نہیں ہوتی اور جوں کا توں باقی رہتا ہے۔

جزئیات کی جانب توجہ

چونکہ دعوتِ حق کا اصل کام مرض باطن کا علاج ہے، اس لئے داعی حق کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں جزئی امور میں نہ کھپائے بلکہ اپنی صلاحیتیں اور قوتیں نفوس میں ایمان کے جاگزیں کرنے پر صرف کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ میں بت رکھے ہوئے دیکھتے تھے لیکن آپؐ نے انہیں نہ خود توڑا اور نہ صحابۂ کرام کو توڑنے کا حکم دیا، کیونکہ اس وقت اہم مسئلہ بتوں کے توڑنے کا نہیں تھا بلکہ دلوں پر پڑے ہوئے تالے توڑنے کا فریضہ درپیش تھا تاکہ جب یہ دل فتح ہو جائیں تو یہ خود ان بتوں کو توڑنے کے

لئے تیار ہو جائیں، چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پہ آپ اپنی عصا سے بتوں کی جانب اشارہ فرماتے جاتے اور صحابۂ کرام ان کو توڑتے جاتے اور آپؐ نے اس موقعہ پہ یہ آیت تلاوت کی۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔

(الاسراء : ۸۱)

("حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے والا ہی ہے")

دوسرا مبحث

شبہات کا ازالہ

شبہات کی حقیقت

شبہات سے مراد یہاں وہ امور ہیں جن سے داعیٔ حق کی سچائی اور اس کی دعوت کے حق ہونے میں شک ہو اور اس کی بنا پر حق نظر نہ آئے اور مخاطب دعوت اس پر لبیک کہنے میں تاخیر کرے۔

شبہات بالعموم موروثی عادت، کسی موجود مصلحت، حمیت جاہلیت اور دنیاوی مفاد کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں اور ان سے کمزور نفوس میں شک پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ حق کے خلاف دلیل سمجھتے ہیں اور داعیٔ حق کے خلاف اسے حجت بناتے ہیں۔

شبہات کا مرکز

اکثر یہ ہوتا ہے کہ مَلَاء (سربرآوردہ لوگ) شبہات پھیلاتے ہیں۔ انہیں خوبصورت بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انہیں بار بار دہراتے ہیں تاکہ عامۃ الناس ان سے متاثر ہو جائیں۔ ان پر تھوڑی سی تنقید کر کے پھر انہیں از سرِ نو مدلل بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ انہیں حقائق ثابت سمجھ لیا جائے پھر ان کا اسی صورت میں دفاع کرتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر اہل حق سے جھگڑتے

ہیں اور اہل حق کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی تضحیک کرتے ہیں۔

شبہات ہمیشہ پیدا کئے گئے ہیں

داعیٔ حق کو اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ دعوت الی اللہ کے بالمقابل شبہات کے پھیلانے اور شکوک کے پیدا کرنے کا عمل ہمیشہ سے ہوتا آرہا ہے اور اہل باطل کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے کہ وہ دعوت کے بارے میں شکوک پیدا کرتے ہیں جو اپنے اسلوب اور کیفیت کے لحاظ سے اور اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت محمدؐ کو مخاطب کر کے قرآن کریم فرماتا ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط

(فصلت: ۴۳)

"تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو"

رسولوں سے جو کچھ کہا گیا وہ باطل تھا اور لوگوں کے لئے شک اور شبہہ پیدا کرنا تھا، اسی لئے فرمایا۔

وَمَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۔ (الذاریات: ۵۲،۵۳)

"ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنوں، کیا ان سب نے آپس میں اس پہ کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں"

یعنی قریش سے پہلے بھی قومیں اپنے انبیاء کو ساحر اور مجنون کہتی رہی

ہیں اور یہی طریقہ قریش نے اختیار کیا تاکہ اہل عرب کو دعوت اسلام اور داعی اسلام سے دور اور متنفر کیا جا سکے۔

داعی اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لے تو اس قسم کے شکوک وشبہات اور اس کی ذات پر اور دعوت پر لوگوں کے اعتراضات پر ناراض نہیں ہوگا کیونکہ کوئی بھی داعیٔ حق سیرت وکردار میں اللہ کے رسولوں سے خوب تر اور فصاحت میں ان سے بلیغ تر نہیں ہو سکتا اور نہ اس میں ان سے زیادہ خلوص ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے اس قدر تائید ایزدی حاصل ہو سکتی ہے جس قدر کہ اللہ کے پیغمبروں کو ہوتی ہے

اس حقیقت کے جاننے سے داعی کو یہ عرفان حاصل ہوگا کہ انسان کی گمراہی اور ضلالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اللہ کے رسولوں کا دشمن بن جاتا ہے حالانکہ اللہ کے رسول انسان کو امراض سے شفا دینے جہنم سے بچاتے اور جنت کا راستہ بتانے آتے ہیں۔

مزید برآں ان امور کا بخوبی سمجھ لینا ہر مسلمان کے لئے بھی ضروری ہے تاکہ اسے خیر وشر کا امتیاز ہو سکے۔ اور وہ ان شبہات سے متاثر ہو کر داعیانِ حق کے دشمنوں کے فریب اور ان کی چالوں میں نہ آجائے۔

شبہات کی انواع

شبہات کی کئی انواع ہیں، کچھ شبہات داعی سے متعلق ہوتے ہیں کچھ دعوت سے متعلق ہوتے ہیں اور کچھ مخاطبین دعوت سے متعلق ہوتے ہیں۔

داعیٔ حق سے متعلق شبہات اس کی سیرت کردار اور اس کے طرز عمل کے بارے میں ابھارے جاتے ہیں، اس پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں اور اسے کم عقل، اسفیہ (بدعقل)، مجنون اور گمراہ کہا جاتا ہے اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ

لوگ اس سے متنفر ہو جائیں اور اس پر اعتماد نہ کریں۔

دعوت سے متعلق شبہات میں دعوت کو ایک نئی بات بدعت اور لوگوں کے رسم و رواج کے خلاف بغاوت اور موروثی نظام سے انحراف قرار دیا جاتا ہے تاکہ لوگ دعوت حق سے متنفر ہو جائیں اور انہیں قبول حق سے روکا جا سکے۔

مخاطبین دعوت سے متعلق شبہات اس طرح پیدا کئے جاتے ہیں کہ انہیں ان کی مصلحتوں کی جانب اور ان کے مفادات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ انہیں قوم اور آباء و اجداد کے دین کا حوالہ دیا جاتا ہے اور انہیں تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مطمئن زندگی اور آسائشات حیات کا تحفظ کریں اور داعیٔ حق کی مخالفت کر کے اپنی مستحکم زندگی کو خطرے میں پڑنے سے محفوظ رکھیں۔

داعیٔ حق کا مُوقف

داعیٔ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان شبہات کے باطل ہونے اور بے دلیل ہونے کو واضح کر دے کیونکہ ان شبہات کی موجودگی لوگوں کو حق کی بصیرت سے اور اللہ کے دین کو قبول کرنے سے باز رکھے گی اور اس طرح وہ غیر مطمئن ہو کر روحانی امراض کے علاج کو قبول نہیں کریں گے۔

ان شبہات کے ازالہ کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو قوت استدلال حسن بیان اور نرمیٔ گفتار سے سمجھایا جائے اور بڑی وضاحت سے شبہات کی حقیقت کو واضح کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ داعی اسے اپنی اَنا کا مسئلہ بنا کر لوگوں سے جھگڑے غصے ہو اور غیر مناسب لب و لہجہ اختیار کرے۔

ہر چند کہ یہ ایک امر دشوار ہے لیکن ناگزیر بھی ہے اور اگر داعیٔ حق

محض رضائے الٰہی کی خاطر یہ فریضہ انجام دے اور اسے جو تکلیف و ایذا پہنچے اس پر اللہ سبحانہ، سے اجر کا متمنی ہو تو اللہ سبحانہ، اس دشوار کام کو اس کے لئے سہل اور آسان فرما دے گا۔ جیسے ایک شفیق ناصح طبیب کے پاس چیختے پکارتے اور اسے برا بھلا کہتے مریض آتے ہیں لیکن طبیب کی پیشانی پر شکن نہیں آتی اور وہ ان کا بڑی دلسوزی اور توجہ سے علاج کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ مریضوں کا یہ رویہ ان کی بیماری کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ اس کا مقصود ان سے ان کے غلط رویہ کا بدلہ لینا نہیں ہے بلکہ ان کا علاج کرنا ہے

شبہات کے دور کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ وہ ہے جو انبیاء کرام کے دعوت کے حق میں اپنی قوم کی جانب سے پھیلائے شبہات کے ازالہ کے لیے اختیار فرمایا، جس کی ہم ذیل میں چند مثالیں بیان کرتے ہیں ۔

۱۔ داعیان حق پر اعتراض

معاشرے کے سربرآوردہ لوگ (مَلَأ) قوم کو دعوت حق سے دُور کرنے کے لیے داعی کی شخصیت اس کی امانت اور اس کی فہم و فراست پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کی شخصیت کو اس طرح مشتبہ ٹھہراتے ہیں، چنانچہ تمام رسولوں کی قوموں نے اپنے رسولوں کو ساحر مجنوں اور بھٹکا ہوا قرار دیا۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۔ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۔ (الذاریات : ۵۲)

"یونہی ہوتا رہا ہے۔ ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔ کیا ان سب نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

نیز مشرکین عرب نے کہا۔

وَعَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ۔ (صٓ : ۴)

"اُن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا۔ کہ ایک ڈرانے والا خود ان ہی میں سے آگیا منکرین کہنے لگے یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے۔

اللہ کے رسولؑ ان شبہات کو دور کرتے اور ان اعتراضات کے جواب دیتے ہیں۔ اور ان افترا پردازوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں اور بہترین اسلوب میں اور بڑی وضاحت سے ان تمام باتوں کا جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت نوحؑ پر قوم نے جو اعتراضات لگائے اور انہوں نے ان کا جواب جس طرح دیا۔ قرآن کریم اس کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔

(الاعراف : ۶۰ - ۶۳)

"اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا۔ ہم کو تو یہ نظر آتا ہے۔ کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوحؑ نے کہا اے برادران قوم میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں۔ بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے۔ جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے"

سب سے پہلی قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو یاقوم (اے میری قوم) کہہ کر مخاطب فرمایا اور ان کی نسبت اپنی جانب فرمائی جس سے پہلے ہی مرحلہ میں تنبیہ ہو گئی کہ ان کا اس طرح باطل پر اڑے رہنا درست نہیں ہے بعد ازاں آپؑ نے بیان فرمایا کہ وہ بھٹکے ہوئے نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یا تو دانائی کی وجہ سے یہ الزام عائد کر رہے ہیں یا پھر وہ جھوٹ بول رہے ہیں اس لئے انہیں اس کذب اور جہل سے باز رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد انہیں بتایا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے رسول ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچاتے ہیں نیز بیان فرمایا کہ وہ اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور ہوئے ہیں انہیں نصیحت کرتے ہیں اور ان کے خیر خواہ ہیں اور یہ کہ لوگ اللہ سبحانہٗ کی حکمتوں سے ناآشنا ہیں اس لئے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ داعئ حق کی بات توجہ سے سنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اس لئے کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اللہ انسانوں ہی میں سے کسی کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب فرمالے جو لوگوں کے سامنے ان کا انجام واضح کرے اور انہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرے تاکہ وہ دنیا اور آخرت میں اللہ کی رحمت سے سرفراز ہوں

اسی مؤثر دلنشیں اور رفیع اسلوب بیان سے حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے شکوک و شبہات کا جواب دیا اور فرمایا۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۔ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ

اَمِیْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ۔ (الاعراف ۶۵-۶۹)

"اور عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کروگے اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات کا انکار کر رہے تھے۔ جواب دیا ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو اس نے کہا اے برادرانِ قوم میں بے عقلی میں مبتلا نہیں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا۔ کہ تمہارے پاس خود تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی ہے۔ تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے۔ بھول نہ جاؤ۔ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا۔ اور تمہیں خوب تنومند کیا اللہ کے قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو امید ہے فلاح پاؤ گے"

۲۔ زمین میں فساد اور سرداری کا حصول

ایک شبہہ داعئ حق کے بارے میں اس کی قوم کے لوگ یہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ سرداری، مرتبہ اور عزت کا خواہاں ہے، اور لوگوں کے عقائد اور ان کی روایات کو بدل ڈالنا چاہتا ہے، یہ لوگوں کو ایسی نئی بات سنا رہا ہے جو اس سے پہلے نہیں سنی گئی جس سے زمین میں فساد پھیل جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ اس داعی کی پوری مخالفت کی جائے اور پوری شدت سے دعوت کو رد کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ نوح، عاد اور ثمود کے اس اعتراض اور ان کے رسولوں کی جانب سے اس کے جواب کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

قَالُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ط تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا
كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ہ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ
اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ
نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ہ

(ابراہیم: ۱۰، ۱۱)

(انہوں نے جواب دیا۔ تم کچھ بھی نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں تم ہم کو اُن ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہیں جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا۔ واقعی ہم کچھ نہیں مگر تم جیسے ایک انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے نوازتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوسند لادیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔

نیز فرمایا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ
یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ
مُّفْتَرًى ط وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ہ

(سبا: ۴۳)

(ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کردے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ قرآن ایک محض جھوٹ ہے گھڑا ہوا ان کا خود ان کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا۔ یہ صریح جادو ہے۔

یعنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں (ملاء) نے قوم میں یہ شبہہ پیدا کیا

کہ داعیٔ حق تمہیں تمہارے آبائی دین سے ہٹا رہا ہے اس لئے تم اپنے رسوم و رواج پر جمے رہو۔

حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ (المؤمنون ۲۳، ۲۴)

"اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتہ بھیجتا۔ یہ بات تو ہم اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں"

قوم نوحؑ کا گمان یہ تھا کہ حضرت نوحؑ بڑا مرتبہ حاصل کرنے، سرداری کے منصب پر سرفراز ہونے اور لوگوں پر اپنی برتری قائم کرنے کے لئے یہ دعوت لے کر اٹھے ہیں۔ کیونکہ اہلِ باطل حق پرستوں کو اپنے غلط معیاروں پر پرکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح انہیں اقتدار مطلوب ہے اسی طرح انبیاء بھی اقتدار کے خواہاں ہیں۔ جیسا کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاۗءُ فِي الْاَرْضِ ۭ (یونس : ۷۸)

"انہوں نے کہا۔ کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے۔ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے"

اس کے بعد قوم نوح نے یہ دلیل پیش کی کہ حضرت نوحؑ انہی جیسے ایک انسان ہیں اور انسان خدا کا پیغام کیسے لا سکتا ہے، بلکہ اس مقصد کے لئے فرشتوں

کو آنا چاہیے تھا، یہی بات قریش نے بھی کہی اور اپنی قوم میں یہ شبہ پھیلایا، اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر خدا فرشتے کو نازل کرتا تو وہ بھی بصورت انسان آتا اور یہ شبہ پھر بھی برقرار رہتا۔

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ (الانعام ۸، ۹)

" کہتے ہیں کہ اس نبی پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی، اور اگر ہم فرشتہ کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے اور انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۲۷، ۱۲۸)

" فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا۔ تو وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے فرعون نے جواب دیا۔ میں ان کے بیٹوں کو قتل کروں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخر کامیابی اُن ہی کے لئے ہے۔ "

ملاءِ قوم نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف فرعون کو بھڑکایا کہ موسیٰؑ فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں اس لئے انہیں کارِ دعوت سے باز رکھنا لازم ہے اور ان کے ماننے والوں کو اس کام پر سرزنش کرنا چاہیئے حضرت موسیٰؑ کو جب ان مشوروں کی اور فرعون کے یہ فیصلہ کرنے کی کہ وہ موسیٰؑ کے ماننے والوں کو قتل کر ڈالے گا اطلاع ملی تو آپ نے مؤمنین سے فرمایا کہ اللہ کی مدد مانگو اور صبر کرو کہ اللہ سے ڈرنے والوں ہی کا انجام خوب ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ پر فرعون کے اعتراضات اور حضرت موسیٰؑ کے جواب کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَقَالَ مُوسٰى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ حَقِيقٌ عَلٰى أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۔

(الاعراف ۱۰۴، ۱۰۵)

(موسیٰؑ نے کہا اے فرعون میں کائنات کے مالک کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں۔

نیز فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلٰى آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدٰى مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝

(الزخرف: ۲۳، ۲۴)

(اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں ہم نے کوئی نذیر بھیجا اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے۔ اور ہم انہی کے نقش قدم کی

پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا۔ کیا تم اُسی ڈگر پہ چلے جاؤ گے۔ خواہ میں تمہیں اس راستے سے صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لئے تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں"

آسائشات حیات سے متمتع ہونے والے معاشرے کے طبقات بالا لوگوں میں تقلید کا شبہہ پھیلاتے ہیں اور انہیں اس امر پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی دین پر جمے رہیں اور دعوت حق کی سخت مزاحمت کریں۔ اس شبہہ کا اللہ کے رسول بڑا منطقی جواب دیتے ہیں۔

اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیه آباءکم

یعنی اصل اتباع تو حق کی ہونی چاہیئے اگرچہ وہ دین آبار کے برخلاف ہو۔ حق وہی جو رسول لے کر مبعوث ہوا ہے تم اس حق پر غور کرو اور اس کا موازنہ اپنے دینِ آبار سے کر کے دیکھو خود ہی تم پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اس جواب سے کافر دلیل ہار جاتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ پاتے کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم رسولؐ کے لائے ہوئے پیغام کو تسلیم نہیں کرتے۔

۳۔ داعیٔ حق کو یہ الزام دینا کہ اس کا کہیں رابطہ و تعلق ہے اور اس کی دعوت ماضی کی خرافات ہے

باطل پرست داعیٔ حق کے بارے میں ایک شبہہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ اس کا کچھ لوگوں سے تعلق ہے جو اسے سکھا پڑھا دیتے ہیں اور انہوں نے ہی اس کو اس دعوت کے کام پہ مامور کیا ہے اور اس کی دعوت کا دین سے یا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور داعی یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان لوگوں کو خوش کرے جن کی در پردہ اعانت اسے حاصل ہے۔

اللہ سبحانہ، قریش اور دعوتِ اسلامی کے بارے میں ان کے پیدا کردہ شبہات کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الفرقان: ۴ - ۶)

"جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے۔ جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے۔ اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے"

۴۔ داعی کو ناآشنا قرار دینا

ایک شبہ داعیٔ حق کے بارے میں یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ کم حیثیت اور ناآشنا شخص ہے۔ اس کا نہ پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہے نہ یہ صاحب دولت ہے اور نہ اسے معاشرے میں کوئی عزت و مرتبہ حاصل ہے اس لئے وہ خود ہر خیر اور دعوتِ اصلاح کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ اگر داعی کی بات سچی ہوتی تو وہ معاشرے کے ذی حیثیت اور صاحب مرتبہ لوگوں میں سے ہوتا، حالانکہ اللہ کو زیادہ علم ہے کہ اس کا پیغام بنی نوع انسان تک پہنچانے کا فریضہ کون انجام دے سکتا ہے۔

مشرکین عرب نے نبی کریمؐ کے بارے میں یہی کہا تھا جسے قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔

(الزخرف: ۳۱، ۳۲)

"کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ یہ تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزربسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کر دیئے ہیں۔ اور ان لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے۔ تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ جو سمیٹ رہے ہیں۔

اور فرمایا

وَقَالُوا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝

(سبا ۳۵-۳۸)

"انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں۔ اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو میرا رب چاہتا ہے۔ کشادہ رزق دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ناپا تلا عطا کرتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے۔ جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہے۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ یہی لوگ جن کے لئے ان عمل کی دہری جزا ہے۔ اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔"

ہر دور کے باطل پرستوں کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس بکثرت مال ہے وہ صاحب اولاد ہیں اور ان کے اعوان و انصار بھی بہت ہیں اس لئے دعوتِ اصلاح کے وہ زیادہ حقدار ہیں اور اس بنا پر وہ اخروی کامرانی کے بھی زیادہ مستحق ہیں۔ حالانکہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ سبحانہٗ اپنی حکمت سے کرتا ہے اور اموال و اولاد اللہ کی قربت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی قربت کا حقیقی ذریعہ اعمال صالحہ ہیں۔

۵۔ متبعین داعی کو کم عقل قرار دینا

دعوت کے بارے میں ان کے اعتراضات میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ داعیٔ حق کے پیروکار اور متبعین گرے پڑے اور بدعقل لوگ ہیں اور وہ اس امر کے اہل نہیں ہیں کہ لوگوں کو راہ ہدایت پر چلائیں اس لئے ملا (سربرآوردہ لوگ) ہی مستحق ہیں کہ لوگوں کی حق کی جانب قیادت کریں اور ان کے لئے کسی حال میں بھی یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ ان مساکین

اور فقرار کے پیرو کار بن جائے اور اپنی عقل وفہم سے کام نہ لیں.

قرآن کریم قوم نوحؑ کے بارے میں بیان فرماتا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ

(ھود : ۲۷)

"جواب میں اُس کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے اُس کی بات کا انکار کیا کہا ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو۔ کہ بس انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں ان لوگوں نے ہمارے ہاں اراذل ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے تمہاری پیروی کرلی ہے۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھ کر ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں"

حضرت نوحؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَا اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

(ھود : ۲۸-۳۱)

اس نے کہا اے برادرانِ قوم ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف ایک کھلی شہادت پر قائم تھا۔ اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا۔ مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں۔ اور اے برادرانِ قوم میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں اُن لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی اور آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں۔ کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں۔ تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا۔ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا علم رکھتا ہوں۔ نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔"

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے سامنے وضاحت کی کہ وہ اللہ جل شانہٗ کی جانب سے اپنے پاس برہان رکھتے ہیں اور اس یقین کامل کے ساتھ اپنی بات پیش کر رہے ہیں کہ یہی دعوتِ حق ہے اور یہی پیغامِ الٰہی ہے اگر یہ حق تمہیں نظر نہیں آتا تو ہم تمہیں اس پر مجبور نہیں کر سکتے بلکہ اس کو جو شخص بھی قبول کرے وہ اپنی مرضی و اختیار سے اور اپنے اطمینان قلب کے بعد کرے۔ کیونکہ دین میں اکراہ کی اجازت نہیں ہے۔

رہ گیا یہ امر کہ میرے متبعین کمزور اور غریب لوگ ہیں تو حق یہ ہے کہ حضرت نوحؑ اللہ کے رسول ہیں ایک اللہ کی عبادت کی جانب پوری قوم کی دعوت

دے رہے ہیں اور مخاطبین دعوت میں فقیری و امیری اور ذی مرتبت اور کم حیثیت ہونے کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جو بھی یہ دعوت قبول کرلے وہ رسول کے متبعین میں شامل ہوجائے گا اور فقیر بے نوا ہونے کی بنا پر وہ ذی حیثیت لوگوں کی خاطر رسولؐ کی مجلس سے نہ اٹھایا جائے گا اور نہ ان سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارے اعمال کا خدا کے یہاں کوئی ثواب اور اجر نہیں ملے گا حالانکہ وہ اپنے رب کی رسالت پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کے قلوب میں موجود ایمان سے بخوبی واقف ہے۔

باطل پرست اور ان کے سربرآوردہ لوگ فقرا اور ضعفاء سے دل تنگ ہوتے ہیں اور انہیں یہ امر ناگوار ہوتا ہے کہ وہ اسی طرح اتباع رسولؐ بن جائیں جس طرح کہ یہ کمزور لوگ بنے ہوتے ہیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ انہیں مجلس سے دور کردیا جائے جیسا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مطالبہ کیا، اور اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکهف : ۲۸)

"اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں۔ اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو کیا تم دُنیا کی زینت پسند کرتے ہو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے۔ اور جس نے اپنے خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کرلی ہے"

غرض خواہشات کے پیروکاروں اور اللہ کی یاد سے غافل لوگوں

کی تجاویز اور مطالبوں پر توجہ دینا جائز نہیں ہے کہ انہی مطالبوں میں ایک مطالبہ فقرار اور کمزور مومنین کو داعی سے دُور کرنا بھی ہوگا۔

یہ چند شبہات اور اعتراضات ہیں جو اللہ سبحانہٗ نے قرآن کریم میں قصص الانبیاء میں بیان کئے ہیں جن میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے داعیٔ حق پر الزام لگانا اور عوام الناس کو اس دعوت کی مخالفت پر آمادہ کرنا تاکہ کافرانہ ماحول جُوں کا توُں برقرار رہے، باطل کا نظام بدستور چلتا رہے اور اس باطل پرست نظام پر ان سربرآوردہ لوگوں (ملأر) کی قیادت اسی طرح قائم رہے۔

داعیٔ حق کا شبہات سے دور رہنا

داعیٔ حق کے لئے مناسب ہے کہ وہ مواقع شبہات سے احتراز کرے تاکہ باطل پرست اس کی ذات سے کوئی بات منسوب نہ کرسکیں۔ خود قرآن کریم میں ایسی دلالتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کے لئے باطل پرستوں کے شبہات سے دور رہنا ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلے تو یہ کہ تمام رسول اور انبیاء اپنی قوم سے کہتے کہ ہم اپنی دعوت پر تم سے کسی مال اور کسی اجر کے مطالب نہیں ہیں بلکہ ہمارا اجر اور صلہ صرف اللہ کے ذمے ہے۔

وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللهِ۔ (ہود : ۲۹)

" اور اے برادرانِ قوم میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے"

نیز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (سبا : ۴۷)

"ان سے کہو، اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے۔ تو وہ تم ہی کو مبارک ہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے"

اگر انبیاء کرام مال طلب کرتے اور لوگوں سے دنیاوی صلہ کے طالب ہوتے تو لوگ کہتے کہ اس دعوت کا مقصد ہی مال و دولت دنیا حاصل کرنا ہے۔ اس لئے انبیائے کرام نے وضاحت کی کہ وہ کسی اجر کے طالب نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں دولت دنیا مقصود ہے۔

۲ - اللہ سبحانہٗ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (العنکبوت : ۴۸)

"اے نبیؐ۔ تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے۔ اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے"

اس آیت میں فرمایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اور قرأت سے واقف نہیں تھے اور باطل پرست جو یہ شبہہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپؐ نے پچھلی کتب سے کچھ مواد حاصل کر کے لکھ لیا ہوگا تو یہ شبہہ غلط ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعیٔ حق کو ایسے امور بھی ترک کر دینے چاہئیں جو فائدے کے حامل ہوں مگر ان سے شبہہ پیدا ہوتا ہو، اس لئے کہ کتابت و تعلیم کی افادیت مسلمہ ہے لیکن ازالہ شبہہ کے لئے آپؐ کو اس سے دور رکھا گیا یعنی شبہہ کے نقصان کے دور کرنے کو زیادہ مفید قرار دیا گیا اور شبہہ والے مفید کام کرنے پر اس کے نہ کرنے کو ترجیح دی گئی۔

۳۔ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؁ (یونس : ۱۶)

دکہو اگر اللہ کی مشیت یہی ہوئی۔ تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ اگر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں نبوت سے قبل چالیس سال گزارے اور اس طویل مدت میں آپؐ کی قوم نے آپؐ کے صدق اور امانت کو تسلیم کیا اور آپؐ کی سیرت طیبہ کی گواہی دی اور برملا اعتراف کیا کہ اس قدر صادق اور امین انسان ہم نے نہیں دیکھا۔ چالیس سال کی مدت تک انتظار کرنے اور اس کے بعد نبوت سے سرفراز کئے جانے کی حکمت یہ تھی کہ آپؐ کا اس قدر طویل مدت صدق امانت کے ساتھ اپنی قوم میں زندگی گزارنا قوم کے شبہات کا رد اور جواب ہو جائے گا کہ یہ وہی ہیں جو اتنے عرصے سے تمہارے درمیان موجود ہیں اور تم خود ان کی سچائی اور امانت کے معترف رہے ہو اب تمہارا ان پر سحر، جنون اور کذب کا الزام عائد کرنا غلط باطل اور سخت ناروا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ شبہات کی وجہ سے پہنچنے والے نقصانات کو دور کرنا بسا اوقات کسی مفید امر کے اختیار کرنے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یعنی یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس برس کی عمر ہونے سے کافی پہلے ہی نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا اور اس طرح دعوتی کام کے لئے آپؐ کو زیادہ وقت ملتا لیکن حکمت الٰہی اسی امر کی متقاضی

ہوتی کہ بعثت مبارکہ چالیس سال کی عمر میں ہوتا کہ شبہات کا ازالہ ہو جائے اور اہل باطل کے دعاوی بے اثر ہو کر رہ جائیں۔

غرض داعیٔ حق اگر کسی موقعہ پر مناسب سمجھے تو اہل باطل کے شبہات کے ازالہ کے لئے اور ان شبہات کے نقصانات سے بچنے کے لئے کسی ایسے امر کو ترک کر سکتا ہے جو فوائد پر مبنی ہو۔ کیونکہ جب ایک مرتبہ کوئی شبہہ یا غلط فہمی عوام میں پھیل جاتی ہے تو وہ جاہل لوگوں اور روایت پرستوں کے نفوس میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں کافی جدوجہد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے داعی کا ایسے طریقے اختیار کرنا موزوں ہوگا جس سے شبہات کا سد باب ہو سکے اور اگر اس سلسلے میں اسے بعض مفید امور ترک کرنے پڑیں تو وہ بھی ترک کر دے کیونکہ اصول یہی ہے کہ مفاسد سے اجتناب حصول فوائد سے زیادہ ضروری ہوتا ہے، اور اگر دو مضرتیں سامنے ہوں تو کم تر مضرت کو برداشت کیا جاتا ہے۔

۴۔ اللہ سبحانہ، نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو شعر کے علم سے اس لئے محفوظ رکھا کہ کہیں یہ اہل باطل کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

بہر حال داعیانِ حق کئی مباح اور جائز امور سے احتراز کے محتاج ہوتے ہیں کہ اہل باطل ان امور کو اللہ کے راستے سے روکنے کا ذریعہ نہ بنا لیں لیکن یہ امتیاز اور فرق ضروری ہے کہ کون سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر شبہات پیدا ہو سکتے ہیں اور کون سے امور خود کار دعوت کا حصہ ہیں اور انہیں

یہ سمجھ کر ترک نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بنیاد بنا کر لوگ اعتراض کریں گے۔ یہ بڑا دقیق موضوع ہے اور خاصی تفصیل چاہتا ہے لیکن یہاں مختصراً ہم یہ اصول بتاتے ہیں کہ جو امور داعی کی ذات اور اس کے مزاج سے متعلق ہوں انہیں داعی چھوڑ سکتا ہے۔ ان میں بعض امور کا چھوڑنا داعی کے لئے مستحب ہے اور بعض کا لازم اور واجب ہے۔ اور جو امور خاص دعوت سے متعلق ہوں یا اس کے طریقہ یا اسلوب سے متعلق ہوں انہیں داعی ترک نہ کرے، مثلاً یہ کہ کسی سربراہ کو دعوت حق دینا یا اس مقصد کے لئے اس سے ملاقات کرنا ترک نہ کرے اس اندیشہ سے کہ لوگ کہیں کہ داعی اس سربراہ کا پروردہ ہے یا یہ کہ داعی اس کی خوشامد کرتا ہے۔

مبحث سوم

ترغیب و ترہیب

مفہوم اور اہمیت

ترغیب سے مراد ایسے امور کا اختیار کرنا ہے جو مخاطب دعوت میں قبول حق کا اشتیاق اور اس پر ثابت قدمی کا عزم پیدا کرنے والے ہوں اور ترہیب سے مراد وہ امور ہیں جن سے مخاطب دعوت قبول حق سے انکار اور احتراز سے ڈرے اور قبول کرنے کے بعد اس پر ثابت قدم نہ رہنے میں خوف محسوس کرے۔

قرآن کریم اس ترغیب اور ترہیب سے بھرا ہوا ہے جس سے قطعی طور پر اس اسلوب کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے اور یہ کہ داعی کو اس اسلوب کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

امور ترغیب و ترہیب

اصل یہ ہے کہ ترغیب رضائے الٰہی اس کی رحمت اور اس کی حسن جزا کی دلائی جائے اور ترہیب اللہ کی ناراضگی اور عذاب آخرت سے ہو، یہی انبیاء اور رسل کا طریقہ رہا ہے جیسا کہ قرآن کریم اور سنت ﷺ نے بیان کیا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ٥ (الاعراف ۱ ۶۳)

"کیا تمہیں اس بات پہ تعجب ہوا ہے۔ کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی ہے۔ تاکہ تمہیں خبردار کر دے۔ اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پہ رحم کیا جائے"

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ٥ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥

(نوح : ۴۱)

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کرے قبل اس کے کہ اُن میں ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے صاف صاف خبردار کرنے والا پیغمبر ہوں۔ اللہ کی بندگی کرو اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا تمہیں ایک وقت مقررہ تک باقی رکھے گا حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجائے تو پھر ٹالا نہیں جاتا کاش تمہیں اس کا علم ہو"

نبی کریم صلی اللہ کی جانب سے قرآن میں آیا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ٥ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ

تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

(التغابن : ۸، ۹)

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں ہار جیت کا دن۔ جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے۔ اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا۔ اور اس کو ایسی جنتوں میں داخل کر دے گا۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ ۝

(محمد : ۱۲)

"ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ اُن جنتوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور کفر کرنے والے بس دنیا کے چند دن کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں۔ اور ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے"

سنت نبویؐ میں ہے کہ آپؐ ایمان لانے والوں کو جنت کی خوشخبری دیتے چنانچہ بیعت عقبۂ اولیٰ کے اصحاب سے آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم نے اس عہد کو پورا کیا تو تمہارے لئے جنت ہے[1] اور ایک مرتبہ آپؐ تشریف لے جا رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ آل یاسر کو قریش ایذا دے رہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا اے اہل یاسر صبر کرو تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے[2]

---

[1]: سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۱۔

[2]: سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۴۲

ترغیب اور ترہیب کی اصل تو یہ ہی ہے کہ آخرت کی جزا اور سزا بیان کی جائے لیکن یہ بھی جائز ہے کہ مخاطبین دعوت کے سامنے قبولیت دعوت سے حاصل ہونے والی خیر اور اس کے عدم قبول پر ملنے والی سزا بھی بیان کی جائے۔ لیعنی یہ ضروری ہے کہ داعی اخروی جزا اور سزا کو نظر انداز نہ کرے۔

ترغیب اور ترہیب کے ضمن میں دنیاوی فوائد اور نقصانات کے بیان کے دلائل یہ ہیں۔

اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ط (النور : ۵۵)

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے ان کے لئے ان کے اس دن کی بنیادوں کو مضبوط قائم کر دے گا جسے اللہ تعالی نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا"

حضرت نوحؑ کے قول کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں نقل کیا۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهَارًا

(نوح : ۱۰، ۱۲)

"میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا۔ تمہارے لئے باغ پیدا کرے گا تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔

اشراف قریش آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے آپؐ کے بارے میں گفتگو کی اور یہ مطالبہ کیا کہ حضرت ابوطالب آپؐ سے بات کریں کہ آپؐ دعوت حق کو ترک کر دیں قریش آپؐ کی ایذا رسانی چھوڑ دیں گے۔ حضرت ابوطالب نے آپ کو بلوایا اور کہا کہ اے بھتیجے میرے پاس یہ سرداران قریش آئے ہیں تاکہ تم سے کچھ لیں اور کچھ تمہیں دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے چچا میری ایک بات ہے جو مجھے دیدیجئے اور اس سے آپ سب پورے عرب کے مالک ہو جائیں گے اور عجم آپ کے تابع فرمان ہو جائیں گے۔ اس پر ابوجہل بولا، تمہارے والد کی قسم، دس باتیں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ بس یہ کہو لا الہ الا اللہ اور معبودان باطل کو چھوڑ دو۔

ترغیب اور ترہیب کے اسالیب

ترغیب اور ترہیب کے اسالیب میں سے ایک یہ ہے کہ مخاطبین دعوت کو جو اللہ کی نعمتیں حاصل ہیں وہ انہیں یاد دلائی جائیں اور انہیں متنبہ کیا جائے کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کریں تاکہ یہ نعمتیں برقرار رہیں اور انہیں باخبر کیا جائے کہ اگر انہوں نے اللہ کے احکام کا انکار کیا اور کفر کیا تو یہ نعمتیں بھی زائل ہو جائیں گی اور عذاب کے بھی مستحق ہوں گے۔

اس اسلوب کی قرآنی آیت حضرت ہودؑ کا یہ فرمان ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف: ۶۹)

"بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند کیا۔ پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

حضرت ہودؑ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّکُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ
بَنِیْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ

(الشعراء : ۱۳۱-۱۳۵)

"ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ دیا تمہیں جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے، اولادیں دیں، باغ دیئے چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے"

حضرت صالحؑ کا یہ قول نقل فرمایا

وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَکُمْ فِی
الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا
فَاذْکُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ (الاعراف : ۷۴)

"یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے تمہیں اس کا جانشین بنایا۔ اور تمہیں زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے ہیں اور اس کے پہاڑوں کو مکانوں کی شکل میں تراشتے ہیں۔ پس اس کی قدرت کے غافل نہ ہو جاؤ۔ اور زمین میں فساد نہ کرو"

قریش کے بارے میں قرآن نے فرمایا۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝
فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ
مِّنْ خَوْفٍ ۝ (القریش)

(چونکہ قریش مانوس ہوئے۔ جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس لہذا اُن کو چاہیے کہ اس رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانا دیا اور خوف سے بچا کر امن دیا۔

ترغیب اور ترہیب کے لوازم

یہ چونکہ انسان اس مادی دنیا میں رہتا ہے، مادی اشیاء کو دیکھتا

اور محسوس کرتا ہے اور دنیا کی دلکشیاں دامن قلب و نظر کھینچتی رہتی ہے جس سے انسان کے تعلق دنیا اور آخرت سے غفلت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس لئے داعی کے لئے لازمی ہے کہ وہ مخاطبین دعوت کو دنیا میں اس قدر انہماک سے ہٹائے اگرچہ انہیں فرار پہ آمادہ نہ کرے بلکہ دنیا اور آخرت کی حقیقت سے انہیں آگاہ کرے اور دنیا کی نعمتوں کا اخروی نعمتوں سے موازنہ کر کے اخروی نعمتوں کی قدر و قیمت اور ان کے دوام سے انہیں باخبر کرے۔

قرآن کریم نے اس موضوع کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے جس سے ایک عاقل مسلم آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے پہ تیار ہو جاتا ہے بلکہ ایک کافر بھی ان حقائق کے موازنہ میں کشش محسوس کرتا ہے اور یہی کشش اسے ایمان تک لے آتی ہے کیونکہ وہ محسوس کر لیتا ہے کہ قرآن کا بیان صداقت پر مبنی ہے اور دنیا کی جو قدر و قیمت قرآن نے بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے۔

اس موضوع پہ قرآنی آیات یہ ہیں۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ط حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ط كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ (یونس: ۲۴)

دنیا کی اس زندگی کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور سبھی کھاتے ہیں۔ خوب گھنی ہو گئی۔ پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پہ تھی اور کھیتیاں بنی سنواری کھڑی تھیں۔ اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے۔ کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پہ قادر ہیں۔ یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم

اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

(الحدید : ۲۰)

" خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی ہے اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے۔ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے سے فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہو جائے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں "

سنت نبویؐ میں دنیا کی تحذیر موجود ہے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے سے منع فرمایا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ

دنیا شیریں و سرسبز ہے اور اللہ نے تمہیں یہاں اس لئے بھیجا ہے کہ یہ دیکھے کہ تم کیا اعمال کرتے ہو تو دُنیا کے معاملے میں اور عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔

اور آپ فرماتے کہ

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ

(اے اللہ آخرت کی زندگی کے سوا کوئی زندگی مطلوب نہیں ہے)

اور آپؐ نے آخرت کے مقابلے دنیا کی قدر واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی آخرت کے بالمقابل ایسی حیثیت ہے جیسے کوئی شخص پانی میں انگلی ڈالے اور اس کی انگلی پر جس قدر پانی لگ جائے۔

مبحث چہارم

تعلیم و تربیت

تعلیم کی ضرورت

مخاطبین دعوت کے دعوت قبول کر لینے اور ان کے ہدایت حاصل کر لینے اور اسلام کے لئے ان کا سینہ کھل جانے کے بعد داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کو ایسی تعلیم دے جس سے انہیں قدیم روحانی بیماری سے تحفظ حاصل ہو۔ معالم دین سے واقف ہو جائے اور ان پر قائم ہو جائے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ داعی دین اسلام کی تعلیمات سے انہیں آگاہ کرے اور انہیں اسلامی اصول و افکار کی تفہیم کرے۔ یہ نہ ہو کہ داعی مخاطبین دعوت کو یونہی چھوڑ دے کہ بس انہوں نے دعوت قبول کر لی اور مسلمانوں میں ان کا شمار ہو گیا ہے یہی کافی ہے، کیونکہ ابھی ان میں شرک وغیرہ کی بہت سی بیماریاں موجود ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر ممکن ہو گا کہ وہ اسلام سے پھر دور ہو جائیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہدایت پر قائم ہیں غیر مہتدر استے پر چل پڑیں۔

سنت نبوی ؐ میں دعوت کے اس مستقیم نہج پر اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم کے لئے متعدد ہدایات موجود ہیں، چنانچہ روایت ہے کہ جب عمیر بن وہب اسلام لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو دین کی باتیں

سکھاؤ اور قرآن پڑھاؤ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص اسلام قبول کرے اسے دین کی تعلیم دینا ضروری ہے اور جو اسلامی تعلیمات سے واقف ہو وہ اسے سکھائے

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم پر مامور فرمایا اور وہ قرآن اور اسلام کی تعلیم دیتے رہے یہاں تک کہ انصار مسلمانوں میں کوئی گھر باقی نہیں رہا جہاں انہوں نے تعلیم نہ دی ہو [2]

جب بنو المصطلق اسلام لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تعلیم دینے کے لئے ایک معلم روانہ کیا [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کی تعلیم کی جانب بہت توجہ فرماتے تھے اور آپؐ کا تعلیم اسلام کا اشتیاق اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو رفاعہ تمیم بن السیدؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے۔ میں پہنچا اور عرض کی کہ میں پردیسی ہوں اور دین کا کوئی علم نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خطبہ منقطع فرمایا میرے پاس تشریف لائے آپؐ کے لئے کرسی رکھی گئی اور آپؐ نے اس پر تشریف فرما ہو کر مجھے تعلیم دی اور اس کے بعد اپنا خطبہ مکمل فرمایا [4]

یعنی تعلیم دین اس قدر ضروری ہے کہ آپؐ نے اس کے لئے اپنا خطبہ منقطع فرما دیا۔

---

۱ : سیرت ابن ہشام ، ج ۲ ، ص ۲۰۸ ۔

۲ : سیرت ابن ہشام ، ج ۲ ، ص ۲۰۸ ۔

۳ : امتاع الاسماع ، ص ۲۴ ۔

۴ : ریاض الصالحین ، ص ، ۲۷۸ ۔

غرض داعیانِ حق پر یہ لازم ہے کہ وہ لوگوں کو احکام اسلامی کی تعلیم دیں اور انہیں حدود اللہ سے روشناس کرائیں اور محض اچھے جذبات کے اظہار اور چند کلمات خیر کے تکرار پر اکتفا نہ کریں، اور محض اس حقیقت کے اظہار کو کافی نہ سمجھیں کہ اسلام ہر دور اور ہر زمانے کے لئے موزوں دین ہے بلکہ ضروری ہے کہ بقدر استطاعت اسلام کی تفصیلی تعلیمات سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

اسلام کی تعلیم و تبلیغ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اسلام کی تعلیمات کو چھپانا جائز نہیں ہے۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا فرض ہے کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر اور تفہیم بیان کریں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَاۤءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ (آل عمران : ۱۸۷)

"ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے اُن سے لیا تھا۔ کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا۔ انہیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے اور تھوڑی قیمت پر اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔"

بعد ازاں ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ جس بنا پر بنی اسرائیل کی قرآن نے مذمت فرمائی ہے ہم اس سے احتراز کریں۔ اور اللہ کی کتاب کی تعلیم و تفہیم کے فریضہ کو انجام دیں [1]

بلاشبہ داعیان حق پر یہ فریضہ بے حد لازم ہے اس لئے کہ ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ علم اور بصیرت کے ساتھ اللہ کی جانب دعوت دیں اور تعلیم و تفہیم کریں

---

[1]: تفسیر ابن کثیرؒ : ج ۱، ص ۲۔

اور جو علم ان کے پاس ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں بخل سے کام نہ لیں، کیونکہ کتمان علم جائز نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ (البقرہ : ۱۵۹-۱۶۰)

(جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، درآں حالانکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے۔ اور تمام لعنت کرنے والے اُن پر لعنت کرتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں۔ اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں۔ اور جو کچھ چھپاتے تھے۔ انہیں بیان کرنے لگیں ان کو میں معاف کر دوں گا میں بڑا درگزر کرنے والا اور معاف کرنے والا ہوں)

تربیت

داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے ساتھ انہیں احکام اسلام پر عمل کرنے اس کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالنے اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے کی تربیت دے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص دس آیات یاد کر لیتا تو وہ ان سے اس وقت تک تجاوز نہ کرتا جب تک ان کے معانی کو خوب اچھی طرح نہ سمجھ لیتا اور ان پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو جاتا۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی بیان کرتے ہیں کہ جن صحابہ کرام سے ہم نے پڑھا ہے انہوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا اور اس وقت صحابہ جب دس آیات

یاد کر لیتے تو اس وقت تک انہیں ترک نہ کرتے جب تک اُن کے جملہ تقاضوں کے مطابق عمل نہ کر لیتے اور اس طرح ہم قرآن اور اس پہ ایک ساتھ سیکھتے تھے۔[۱]

مفاہیم اسلام کی تربیت ضروری ہے۔

مفاہیم اسلام کی تربیت اور ان کے مطابق اپنے عمل کو ڈھال لینے کی تربیت مسلمان کے لیے بے حد ضروری ہے اور کوئی مسلمان اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لئے داعیٔ حق کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے اور اس ذمے داری کو اپنے فرائض میں سرفہرست رکھے۔

اسلامی احکام کے علم کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں ہے جب تک وہ دل میں گھر نہ کر جائیں اور عملی زندگی میں سمو نہ جائیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو جسمانی نشوونما اور فزائش جسم کے اصول و طریقے یاد ہوں اور جب اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے وہ انہیں بخوبی بیان کر دے مگر خود ان پر عمل نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس کی جسمانی افزائش محض اس علم سے نہیں ہو سکتی اسی طرح جو شخص احکام اسلامی جانتا ہو مگر ان کے مطابق اپنی تربیت نہ کرے اور ان پر عمل نہ کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ علم بے فائدہ ہے۔ بلکہ اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ ایسا صاحب علم آزمائش میں مبتلا ہو کر دین سے ہی برگشتہ ہو جائے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِاطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ (الحج : ۱۱)

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۔

"اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے۔ جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا۔ اور جو کوئی مصیبت آئی تو اُلٹا پھر گیا۔ اُس کی دنیا بھی گئی آخرت بھی گئی یہ ہے صریح خسارہ"

یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں بطور خاص اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت ہوئی اور عقائد اسلامی کو پوری طرح ذہن نشین کرایا گیا اور اس عظیم گہری تربیت سے صحابۂ کرام کندن بنے اور ان کے قلوب نے جلا پائی اور وہ اسلام کا عملی نمونہ بن کر اسلام کے

اولین سالار اور فاتح عالم بنے اور انہوں نے اللہ کے راستے میں ایسی تکالیف برداشت کیں، جس کی کوئی حد نہیں اور انہوں نے حد درجہ جانفشانی سے اسلام کو دنیا کے چپے چپے میں پھیلا دیا۔

تربیت کی علامات

تربیت کی علامت یہ ہے کہ مسلم تاحیات اللہ جل شانہٗ سے وابستہ رہے انہی سے تعلق قائم رکھے انہی کی رضا مقصود ہو، ان ہی کے ذکر میں لطف آئے اور انہی کی عبادت مطلوب ہو۔

یہ مقصود اس قدر بڑا اور عظیم الشان ہے کہ تمام طالبین اس مقصود کے طلبگار ہوں مگر ان میں آپس میں کوئی حسد اور رقابت نہیں ہو سکتی بلکہ وہ انس و محبت کے ساتھ حب الٰہی کی اس شاہراہ پر سفر کریں گے۔

مگر یہ مقصود کاہلی سے اور بیٹھے رہ کر امیدیں قائم کر کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کوئی شخص مکہ جانا چاہیئے تو وہ سفر کا اور روانگی کا عزم کرے گا، اہل خانہ اور رشتہ داروں کی جدائی برداشت کرے گا، سفر کریگا اور زاد راہ لے گا اور زاد راہ بھی تقوی کا زاد راہ ہو گا اور اپنی پوری زندگی اللہ رب العالمین کی نذر کر دے گا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۙ

(الانعام : ۱۶۲)

"کہو میری نماز میری تمام سراسر عبودیت میرا مرنا اور میرا جینا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لئے ہے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعلیٰ ترین مقصود کے حصول کے لئے زادِ تقویٰ کی تاکید فرمایا کرتے تھے چنانچہ مدینہ منورہ کے پہلے ہی خطبہ میں آپؐ نے تقویٰ الٰہی اور تعلق آخرت کی نصیحت فرمائی۔ [1]

تربیت کے وسائل

تربیت کے مؤثر وسائل میں سے یہ ہے کہ اللہ کی کتاب سے خوب تعلق ہو اور قرآن کی تلاوت کی جائے اسے سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے اور قلب کے دریچے اس کے نور کے حصول کے لئے کھول دیئے جائیں تاکہ قلب کی بیماریاں دور ہوں اور اس میں حقیقی حیات پیدا ہو، کیونکہ قرآن کریم نور، ہدایت، شفا اور روح ہے، اس نور کی موجودگی میں ظلمت اس شفا کے ساتھ مرض اور اس روح کے ساتھ موت باقی نہیں رہتی۔ فرمان الٰہی ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (البقرہ : ۱-۲)

"الف، لام میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں"

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

(الاسراء : ۸۲)

ہم اس قرآن مجید کو سلسلہ تنزیل میں اس طرح نازل کر رہے ہیں۔ جو ماننے والوں

---

[1] : ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۱۸۔

کے لئے شفا اور رحمت ہے"۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط (الشوریٰ:۵۲)

"اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے"۔

نیز ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کی طرح سیرت نبوی[ؐ] سے بھی تعلق قائم رکھے اور یہ تعلق اس قدر مضبوط ہو جائے کہ ایسا محسوس ہو جیسے وہ سرکار دو عالم[ؐ] کے عہد میں زندہ ہے اور وہ حدود زمانہ کو عبور کرکے اپنی روح ان کی سیرت سے پیوست کردے اور اس کی اتباع کرے۔

داعئ حق ان اصولوں کے ماتحت دعوت قبول کرنے والوں کی تربیت کرے تاکہ وہ اسلام پر بخوبی قائم ہو جائیں اور خود ان میں سے داعیان حق پیدا ہو جائیں کیونکہ صاحب فہم و بصیرت داعیانِ کا پیدا ہوتے رہنا اسلام کی مستقل ضرورت ہے۔

فصل سوم

دعوت کے وسائل

تمہید

وسائل سے ہماری مراد وہ طریقے ہیں جو دعوتِ حق میں مفید اور نفع بخش ہوں اور یہ دو قسم کے ہیں۔

ایک قسم وہ وسائل ہیں جن کا تعلق اسباب کے اختیار کرنے سے ہو تاکہ وہ دعوت الی اللہ کی تبلیغ کے لئے موزوں اور مناسب ماحول تیار کر سکیں اور انہیں ہم دعوت کے خارجی وسائل کہتے ہیں اور دوسری قسم کے وہ وسائل ہیں جو خود کارِ دعوت سے متعلق ہوں اور انہیں ہم نے وسائل تبلیغ دعوت کہا ہے۔

اس لئے اس فصل کو ہم دو مبحث میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا مبحث : خارجی وسائل

دوسرا مبحث : تبلیغ دعوت کے وسائل

پہلا مبحث

دعوت کے خارجی وسائل

اساس وسائل

ان وسائل کی اساس یہ ہے کہ عملی زندگی اور اس میں اسباب اور مسببات کے تحت وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کی جانب نقطۂ نظر درست ہو۔

دعوت کے خارجی وسائل متعدد ہیں لیکن ہم ان میں سے دو بیان کریں گے۔ حذر اور استعانت۔

ذیل میں ہم ان وسائل کو تین حصوں میں بیان کر رہے ہیں۔

پہلا حصہ

حذر

حذر کا مفہوم

حذر کے لغوی معنی تحرز کے اور بچنے کے اور احتیاط کے ہیں۔ چنانچہ رجل حَذِرٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو محتاط ہو اور آئندہ جن ناگوار امور کا اسے اندیشہ ہو ان سے بچنے کے ذرائع اختیار کرتا ہو۔[1]

---

[1] : لسان العرب - حرف الراء

حذر ایک قابل تعریف وصف ہے

حذر کی لغوی تعریف سے معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد احتیاط اور معرفت ہے یعنی جو شخص حذر اختیار کرنے والا ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ اسے کس قدر ناگوار امور پیش آسکتے ہیں اور ان کے دور کرنے اور ان سے بچنے کے کیا اسباب و ذرائع ہو سکتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے مفہوم میں وہ خوف شامل نہیں ہے جس سے آدمی چپک کر رہ جائے، اس کا دل لرز جائے اور اس میں بزدلی پیدا ہو جائے اور وہ فکر و اضطراب میں مبتلا ہو جائے اور اس کیفیت سے نجات کی امید منقطع ہو جائے

اس لحاظ سے ہم کہتے ہیں کہ حذر و احتیاط اخلاق حسنہ میں سے ہے اور کائنات میں جاری اللہ کی سنتوں کا ادراک کرنے والے مؤمنین کی صفت ہے اور حماقت، جہالت کے حامل کم عقل لوگوں کی صفت نہیں ہے۔ کیونکہ کم عقل اور بے بصیرت افراد اس قدر کوتاہ نظر ہوتے ہیں کہ وہ پیش آمدہ کسی ناگوار امر کو اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتے جب تک وہ عملاً واقع نہ ہو جائے اسی لئے وہ غافل اور بے پرواہ رہتے ہیں اور جب کوئی امر ناگوار پیش آجاتا ہے تو حیران اور ششدر رہ جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مرد دانا اور شخص بدعقل میں فرق ہی یہی ہے کہ صاحب عقل شخص خطرے کو اس کی آمد سے قبل بھانپ لیتا ہے اور امر ناگوار پیش آنے سے پہلے اس کا اندازہ کر لیتا ہے اور پھر اس کی احتیاط کرتا ہے اور اس سے بچاؤ کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔ جبکہ بدعقل شخص کو اس وقت تک احساس نہیں ہوتا جب تک کہ حادثہ پیش نہ آجائے اور اسی وجہ سے احتیاطی تدابیر بھی اختیار نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے جاہل شخص محتاط آدمی کے رویۂ احتیاط کو بزدلی اور خوف سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس خوف کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ ایمان سے ہم آہنگ نہیں ہے

محتاط شخص بھی بسا اوقات جاہل افراد کی ان باتوں سے متاثر ہو جاتا ہے اور احتیاط ترک کر کے اندیشہ اور خطرے سے تجاہل برتنے لگتا ہے، اس صورت میں داعیٔ مسلم کو چاہیئے کہ وہ ان باتوں کی جانب متوجہ نہ ہو۔

محتاط شخص کی مثال اس جہازراں کی سی ہے جو اپنے جہاز کو سمندری حالات اور ستاروں کی رفتار اور تمام معلومات کی روشنی میں احتیاط کے ساتھ لے کر جا رہا ہو۔ اور سلامتی کے ساتھ جہاز کو نکال کر لے جائے۔ جبکہ جاہل احمق کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سمندری مدوجزر کے علم کے بغیر کشتی سمندر میں ڈال دے اور سمندری کیفیات وحالات کی فنی معلومات کی پروا نہ کرے بلکہ ان کی مخالفت کرے نتیجہ یہ کہ اس کی کشتی ٹوٹ پھوٹ جائے اور حسن نیت اور خدا کی رضا پر راضی ہونے کے باوجود وہ خود اور جو کشتی میں موجود ہوں سب غرق ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ حسن نیت پر اسے خدا کے یہاں ثواب ملے لیکن دنیا کے معاملات کسی شخص کی نیت اور ارادے کے تحت ~~نہیں ہیں~~ بلکہ وہ اسباب اور مسببات کے تابع ہیں۔

قرآن کریم سے حذر کے حق میں دلیل

اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝

(النساء: ۱۰۲)

(اے نبیؐ جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو۔ اور حالت جنگ میں انہیں پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو۔ اور اپنا اسلحہ لئے رہے۔ جب وہ سجدہ کرے تو پیچھے چلا جائے۔ اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے۔ آکر تمہارے ساتھ پڑھے۔ اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنا اسلحہ لیئے رہے۔ کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو۔ یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں۔ مگر پھر بھی چوکنے رہو یقین رکھو۔ کہ کافروں کے لئے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے")

اس آیت کریمہ سے قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہوا کہ حذر و احتیاط لازم ہے بلکہ اس آیت میں حذر کی کیفیت و اہمیت بھی بیان کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ مسلمان اپنا اسلحہ سنبھال لیں اور بعض مسلمان نماز پڑھیں اور بعض ان کی دشمن سے حفاظت کریں اور اس طرح مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں ایک نماز پڑھے اور ایک نگہبانی کرے

نیز اس آیت میں بیان کیا گیا کہ کفار چاہتے ہیں کہ مسلمان غافل ہو جائیں تو وہ ان کا قلع قمع کر دیں، اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حذر و احتیاط لازمی ہے۔

یہاں پر ہم امام القرطبیؒ کی تفسیر سے چند کلمات نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے علماء نے حذر و احتیاط کی اہمیت کو کس قدر محسوس کیا ہے اور کس طرح کتاب الٰہی کے مفاہیم متعین کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی ہے۔

امام القرطبیؒ فرماتے ہیں۔

کہ اس آیت میں حذر و احتیاط کی تاکید کی گئی اور اسلحہ سنبھالنے کا حکم دیا گیا۔ تاکہ دشمن غفلت سے فائدہ نہ اٹھا لے۔ اس کے بعد یہ وضاحت فرمائی کہ کافر اسی بات کے متمنی ہیں کہ تم ذرا غافل ہو جاؤ تو انہیں مسلمانوں کے استیصال کا مقصود حاصل ہو جائے۔ غرض اس بیان اخذ سلاح اور حذر و احتیاط کی حکمت

بھی معلوم ہو گئی ۔

اس آیت میں اس امر پر بھی دلیل موجود ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا اور ان تمام ذرائع کو اختیار کرنا جو سلامتی پر منتج ہوں ضروری ہے ۔ اسی لئے فرمایا کہ بیدار اور متنبہ رہو اور تمام حالات میں دشمن سے محتاط رہو کیونکہ لشکر پہ سب سے بڑی مصیبت حذر و احتیاط میں کوتاہی سے آتی ہے ۔[1]

اللہ سبحانہ فرماتے ہیں ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا ٥ (النساء : ۷۱)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہو ۔ پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر ۔"

اس آیت میں مؤمنین کو مخاطب کر کے انہیں جہاد کا حکم دیا گیا اور اللہ کے راستے میں نکلنے کا حکم دیا گیا اور احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا حکم دیا گیا ۔ اور نصیحت فرمائی گئی کہ دشمن کے مقابلے میں ناواقفیت اور نادانی کی کیفیت میں نہ نکلو اور انہیں یہ موقعہ نہ دو کہ وہ تمہاری ساری تیاریوں کی کیفیت معلوم کرلیں اور آسانی سے تم پر حملہ کر سکیں ۔[2]

سنت نبوی ﷺ سے حذر کی دلیل

سنت نبوی ﷺ میں ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلم کے لئے حذر و احتیاط لازم ہے اور بالخصوص جس داعی حق کو کفار کے مکائد اور

[1] : تفسیر القرطبی ، ج ۵ ، ص ۲۷۱ - ۲۷۲ ۔

[2] : تفسیر القرطبی ، ج ۵ / ص ۲۷۲ ۔

منافقین کی سازشوں کا سامنا ہو، اس کے لئے احتیاط بے حد لازم ہے۔ ہم اس کی سنت ؐ سے چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ ؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک روز دوپہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور اس وقت آپ تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر ؓ نے آپ ؐ کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ آپ ؐ تو اس وقت کبھی تشریف نہیں لاتے ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ جب آپ ؐ اندر تشریف لائے تو حضرت ابوبکر ؓ نے آپ ؐ کو پلنگ پر جگہ دی اور آپ ؐ تشریف فرما ہو گئے، اس وقت حضرت ابوبکر ؓ کے پاس میں اور میری بہن اسماء بنت ابی بکر تھیں۔ آپ ؐ نے فرمایا، جو تمہارے پاس ہو ہٹا دو، اس پر حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ؐ یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں، آپ ؐ پر میرے ماں باپ قربان، تو آپ ؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نکلنے کا اور ہجرت کا حکم فرما دیا ہے۔[1]

بعدازاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر گھر کے پچھلے چھوٹے دروازے سے باہر آئے اور جبل ثور کے غار کی جانب روانہ ہوئے، غار تک پہنچتے پہنچتے سرکار ؐ کے قدموں سے خون ٹپکنے لگا۔ آپ ؐ غار میں تشریف لے گئے تو مکڑی نے اس پر جالا تن دیا اور کبوتروں نے انڈے دے دیئے۔[2]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حذر، احتیاط لازم ہے، اس لئے کہ

(الف) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر ؓ کے گھر تشریف لائے کہ اس وقت عادۃً لوگ باہر نہیں نکلتے یا کم نکلتے ہیں۔

(ب) آپ ؐ نے حضرت ابوبکر ؓ سے خلوت کے لئے کہا مبادا آپ ؐ کی باتیں باہر کسی کو نہ پہنچ جائیں جب حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ صرف ان کی بیٹیاں گھر میں ہیں تب

[1]: سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۰۔ متاع الاسماع ص ۲۹۔
[2]: سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۸۔ متاع الاسماع ص ۴۰۔

آپ نے انہیں حکم ہجرت کی اطلاع دی۔

(ج) گھر کے اصل دروازے کے بجائے پچھلے دروازے سے باہر تشریف لے گئے۔

(د) غار میں چھپے رہے اور غار تک پہنچنے کے لئے تکلیف برداشت کی

(ھ) اللہ سبحانہ' نے بھی مکڑی کو جالا تن دینے اور کبوتروں کو گھونسلے بنا دینے کا حکم فرمایا تاکہ مشرکین کی نظر غار کے اندر دونوں اصحاب پر نہ پڑے۔

۲۔ قریش نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا تو جبریلؑ آپؐ کے پاس آئے اور کہا کہ آج رات آپؐ اپنے بستر پر نہ سوئیے، جب رات ہوئی تو قریش آپؐ کے دروازے پر گھات لگا کر بیٹھ گئے کہ آپؐ سو جائیں تو آپؐ کو قتل کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر حضرت علی کو فرمایا کہ تم میرے بستر پر میری یہ خصوصی چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ تمہیں ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں مٹی لی اور ان پر پھینکی اور باہر نکل گئے اور کافر آپؐ کو نہ دیکھ سکے۔[1]

۳۔ مکہ مکرمہ میں جب صحابۂ کرام نماز پڑھتے تو گھاٹیوں میں چلے جاتے اور چھپ کر نماز پڑھتے۔[2]

حذر و احتیاط کی ضرورت

یہ امر تو معلوم ہو گیا کہ حذر و احتیاط لازمی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا داعی حق کے لئے بھی احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ کہ جب یہ ضرورت پیش آئے

[1]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۵۔

[2]: ابن ہشام ج ۱، ص ۲۷۵

تو کیا یہ لازمی ہے کہ وہ اس پر عمل کرے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلا شبہ دعوت کے ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں داعی کے لئے حذر و احتیاط لازم ہو جاتی ہے مثلاً یہ کہ داعی کسی کافرانہ ماحول اور بت پرستانہ معاشرے میں ہو اور اس کے گرد و پیش معاشرہ اس کا مخالف ہو اور اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہو یا وہاں کے لوگ اس کے درپے آزار ہوں تو اس صورت میں اس پر حذر و احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کی عدم احتیاط اس کے لئے باعث ہلاکت بن جائے گی اور داعی حق کے جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ حالانکہ اگر اپنی جان بچا لینے کی گنجائش موجود ہو تو خود کو معرض ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں ہے، بلکہ ہلاکت سے بچنے کے اسباب کو اختیار کرنا لازم ہے۔ نیز یہ کہ اگر داعی کی زندگی باقی رہے اور اسے نقل و حرکت کی آزادی میسر رہے تو اس سے نشر اسلام میں بڑا اضافہ ہو گا اور عدم احتیاط کی بنا پر خیر کثیر خطرے میں پڑ جائے گی۔

حذر و احتیاط اور اللہ پر توکل

یہ امر واضح ہے کہ حذر و احتیاط کا لازم ہونا، بچاؤ اور حفاظت کی تدابیر اختیار کرنا اور نقصان سے تحفظ کے اسباب اختیار کرنا اللہ پر اعتماد اور توکل کے خلاف نہیں ہے، البتہ یہ ہے کہ اسباب پر مطمئن ہو جانا اور انہی پر بھروسہ کر لینا جائز نہیں ہے کیونکہ اسباب بھی اللہ کے اختیار میں ہیں اور ان پر نتائج کا مرتب بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہی اسباب پیدا کرتا ہے ان کے اختیار کرنے کی توفیق دیتا ہے اور ان کو نتیجہ خیز بناتا ہے اور اگر وہ چاہے تو اسباب کی سببیت ہی ختم کر دے (اور ان پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو) اس لئے کہ حقیقت یہ ہے

کہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ لیعنی مسلم اسباب کو اس لئے اختیار نہیں کرتا کہ اسے اسباب پر بھروسہ ہے بلکہ وہ اس لئے اسباب کو اختیار کرتا ہے کہ اسے اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کا حقیقی اور قلبی اعتماد صرف ایک اللہ سبحانہٗ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابو بکرؓ کو آپ کی حیات کے بارے میں تامل ہوا اور آپؐ کے چہرے پر رنج و غم کے آثار ظاہر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی معیت اس کی نصرت اس کی حفاظت۔ اور اس کی تائید پر اعتماد کا اظہار فرمایا۔ اور اس واقعہ کی جانب قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۚ (التوبہ : ۴۰)

(جب وہ صرف دو میں سے کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

حذر و احتیاط کی اقسام

حذر و احتیاط کے کئی پہلو ہیں، مثلاً معاصی سے احتیاط، اہل خانہ اور اولاد سے احتیاط، اتباع ھوٰی سے احتیاط اور منافقین اور کافرین سے احتیاط، ہم ان سب کے بارے میں مختصراً عرض کرتے ہیں۔

معاصی سے احتیاط

اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے

وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ط (آلِ عمران : ۲۸)

("مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈرتا ہے")

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عقاب سے ڈراتا ہے کہ تم اس کے جناب میں معاصی کا ارتکاب کرو اور ایسی خطاؤں کے مرتکب ہو جو اللہ جل شانہ کی ناراضگی کا سبب اور اس کی نصرت اور تائید کے انقطاع کا باعث بنیں۔ اس لئے داعیٔ حق کو ڈرنا چاہیئے کہ اس سے کوئی ایسی کوتاہی سرزد نہ ہو جس سے وہ اللہ جل شانہ کی ناراضگی کا مورد بن جائے اور اس سے نصرت و تائیدِ الٰہی اٹھالی جائے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ سبحانہ سے اپنا تعلق قائم رکھے اور اللہ کے غضب سے ڈرتا رہے اور اپنے نفس کے چھپے ہوئے گوشوں کو ٹٹولتا رہے کہ ریا کا کوئی شائبہ بھی موجود نہ ہونے پائے۔ حالانکہ ریا سے شہرت سے، خود پسندی سے لوگوں پر تفوق جتلانے اور اسی طرح کے امراض نفس سے بچنا بے حد مشکل ہے لیکن کارِ دعوت کے لئے ان سب امور سے اجتناب لازمی ہے کہ اللہ سبحانہ سے کسی کے دل کی کوئی بات بھی مخفی نہیں ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ (البقرہ: ۲۳۵)

(خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اُس سے ڈرو)

اہلِ خانہ اور اولاد سے احتیاط

آدمی کے اہلِ خانہ اور اس کی اولاد اس کی بزدلی اور اس کے بخل کا باعث بنتے ہیں اور ان کی محبت میں مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت سے قاصر رہتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے اور ہر عملِ حسن سے اس لئے باز رہتا ہے اور اس طرح گھر والے اور اولاد اس کے حق میں دشمن بن جاتے ہیں اور دشمن سے بہرحال حذر و احتیاط لازم ہے۔[1]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ

[1] تفسیر القرطبی، ج ۱۸، ص ۱۴۱۔

فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن : ۱۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں اُن سے ہشیار رہو۔"

ابن العربی المالکیؒ کہتے ہیں کہ یہ مقصود نہیں ہے کہ فی الواقع آدمی کے گھر والے اور اس کی اولاد اس کے دشمن ہوتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال اس کے حق میں دشمنی کے درجے میں ہوتے ہیں اور اس سے بڑی دشمنی کسی مؤمن کے حق میں اور کیا ہوگی کہ کوئی شخص اس کے اور اس کے رب کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک الاشجعی کے بارے میں نازل ہوئی تھی کیونکہ وہ جب جہاد پہ جانے کا ارادہ کرتا اس کے بیوی بچے رونے لگتے اور کہتے کہ ہمیں کس سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو تو اس کا دل نرم پڑ جاتا اور جہاد کے لئے نہ جاتا۔[1]

غرض داعی حق کو اہل و اولاد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیئے کہ وہ اس کی بزدلی اور بخل کا باعث نہ بنیں اور اسے اپنی نادانی کی بنا پر راہ حق میں جہاد اور کار دعوت سے نہ روک لیں۔

اتباعِ ھوی سے حذر و احتیاط

داعیٔ حق کو اتباع ھوی میں مبتلا ہو جانے سے ڈرنا چاہیئے اور احتیاط کرنی چاہیئے اور یہ سمجھ کر لوگوں کی خواہشوں کی تکمیل نہ کرنی چاہیئے کہ لوگ زیادہ دعوت قبول کریں گے اور امر حق کی اشاعت ہوگی۔

---

[1]: القرطبی ص ۱۴

اس لئے کہ دعوت الی اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ خیانت کے ساتھ اور اللہ کو ناراض کر کے کارِ دعوت پھیلایا جائے۔

اللہ سبحانہ' نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (المائدہ: ۴۹)

"پس اے نبیؐ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں۔ جو خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہودی علماء نے آپس میں یہ سازش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر آپؐ کے سامنے اپنا مطالبہ رکھتے ہیں اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ یہ علمائے یہود آپؐ کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپؐ کو معلوم ہی ہے کہ قوم یہود میں ہمارا کیا مقام و مرتبہ ہے اگر ہم نے اسلام قبول کر لیا تو تمام یہود اسلام قبول کر لیں گے، ہمارا فلاں لوگوں سے نزاع ہے ہم ان کا مقدمہ آپؐ کے پاس لائیں گے تو آپؐ ہمارے حق میں فیصلہ فرما دیجئے، تو ہم اور سب یہود اسلام لے آئیں گے۔ لیکن آپؐ نے ان کی یہ بات قبول کرنے سے انکار فرما دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

منافقین اور کافروں سے احتراز

منافقین کی بہت سی اصناف ہیں جن میں سے کچھ خالص منافق

[1]: القرطبی ج ۶، ص ۲۱۲

ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں نفاق کا شائبہ ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ان کے متعدد درجات ہوتے ہیں۔ بہرحال مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کا ضرر بہت زیادہ ہوتا ہے اور کفار کے ضرر سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے کافر ظاہر ہوتے ہیں جبکہ منافق مخفی ہوتے ہیں۔

غرض داعیان حق کو چاہیے کہ منافقین سے محتاط رہیں ان کی کوئی بات نہ سنیں اور ان پر اعتماد نہ کریں اور ان کے مکاید کا سدباب کریں۔

اللہ سبحانہ منافقین کے مکائد اور ان سے متنبہ رہنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۖ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۖ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(المنافقون : ۴)

"انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ مگر اصل میں گویا یہ لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں۔ ان کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو۔ اللہ کی مار ان پر، یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں"

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ حذر و احتیاط کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آپؐ ان کے قول پر اعتماد کرنے سے احتراز کیجئے اور دوسرے یہ کہ آپؐ محتاط رہیئے کہ کہیں یہ آپ کو اپنے باطل کی طرف مائل نہ کرلیں اور آپؐ کے اصحاب کی رسوائی کے باعث نہ بن جائیں۔[1]

---

[1] ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۶۸

حذر و احتیاط کے وسائل

حذر و احتیاط کے وسائل متعدد ہیں اور مختلف حالات و ظروف میں جدا جدا وسائل استعمال کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ ہم یہاں پر بطور مثال وہ چند وسائل بیان کریں گے جو آثار میں مذکور ہوتے ہیں اور بوقت ضرورت ان پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور ان وسائل کو داعی بت پرست معاشروں میں بروئے کار لا سکتا ہے جیسا کہ داعی افریقی ممالک جائے اور وہاں تبلیغ اسلام کرے۔

۱۔ ایسے بت پرست اور کافر معاشروں میں جہاں اسلام کی اشاعت وہاں کے سربرآوردہ طبقوں کے مزاج کے خلاف ہے وہاں سب سے پہلے داعی حق کو دشمنوں سے متنبہ رہنا چاہیئے اور ان لوگوں کو دعوت پیش کرنی چاہیئے جو قابل اعتماد ہوں چنانچہ جب حضرت ابوبکر اسلام لائے تو اپنی قوم کے ان لوگوں کو اسلام پیش کیا جن کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست تھی اور جو قابل اعتماد تھے [۱]

۲۔ کافروں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے داعی حق اپنے آپ کو مخفی رکھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق نے غار میں اختفا اختیار فرمایا تھا۔

۳۔ قوم سے علیحدگی اختیار کر کے ان سے اختفا اختیار کرے جیسا کہ اصحاب کہف نے اختیار کیا تھا۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ۝

(الکہف : ۱۶)

جبکہ تم ان سے اور اُن کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو۔ تو چلو اب فلاں

غار میں جاکر پناہ لو تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا خزانہ وسیع کرے گا۔ اور تمہارے کام کے لئے سروسامان مہیا کردے گا۔"

اعتزال کی مذکورہ صورت جائز ہے تو اس سے کم صورتیں یعنی عدم اختلاط، ترک ملاقات اور کچھ وقت کے لئے کارِ دعوت کو ترک کر دینا بھی جائز ہے اور اس صورت میں داعی کو چاہیئے کہ اپنی ذات پر توجہ کرے اور عبادت میں زیادہ اوقات صرف کرے اور امور دعوت میں غور و فکر کرے۔

۴۔ کافروں کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے پر امن جگہ چلا جائے جیسے مسلمان حبشہ چلے گئے تھے۔[۱] خود اللہ سبحانہ نے داعئ حق کے دشمنوں کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے چلے جانے کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے جو اس کے جواز کی مزید دلیل ہے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى قَالَ يٰمُوۡسٰۤى اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ فَاخۡرُجۡ اِنِّىۡ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيۡنَ ۝ فَخَرَجَ مِنۡهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝

(القصص: ۲۰، ۲۱)

"اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا موسیٰ سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکل جائیں تیرا خیر خواہ ہوں۔ یہ سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی اے میرے رب مجھے ظالموں سے بچاؤ"

۵۔ اگر اظہار اسلام میں کفار کی ایذا رسانی کا اندیشہ ہو تو اپنے اسلام کو مخفی رکھ سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

---

[۱]: سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۴۹۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ط (مومن : ۲۸)

"اس موقع پر آلِ فرعون سے ایک مومن شخص جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔ بول اٹھا کہ تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کرو گے۔ کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے بیّنات لے کر آیا ہے"

اس مقام پر اللہ سبحانہٗ نے اس شخص کا واقعہ بیان فرمایا جس نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا جس سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت کتمانِ ایمان جائز ہے اور داعی الی اللہ کا اپنے داعی حق ہونے کو چھپانا بھی جائز ہے بلکہ اپنا نام بھی مخفی رکھنا درست ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ بدر تشریف لے جا رہے تھے تو کسی عرب نے آپ دونوں کا تعارف چاہا اور آپؐ نے نام بتانے سے گریز فرمایا[۱]

اخفاء ایمان کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ کے باہر منیٰ کی عقبہ (گھاٹی) میں ملاقات کا وعدہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت کعب بن مالک بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی قوم کے ساتھ آنے والے افراد کو کافروں سے مخفی رکھا، اس رات اپنی قوم کی ساتھ سوئے جب ایک تہائی شب گزر گئی تو پڑاؤ سے نکلے اور چپکے چپکے اور چھپتے ہوئے آپؐ سے ملاقات کے لئے عقبہ کے پاس پہنچے، ہم کل تہتر (۷۳) افراد تھے اور دو خواتین تھیں عقبہ پہنچ کر ہم نے آپؐ کا انتظار کیا یہاں تک کہ آپؐ حضرت عباس کے ساتھ تشریف لے آئے[۲]

---

[۱] : سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۵۵

[۲] : سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۹۔

۶ - جُدا جُدا ہو جانا اور ایسا رویہ اختیار کرنا کہ کفار متوجہ نہ ہوں. جیسا کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت یعقوبؑ کا قول نقل کیا ہے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (یوسف : ۶۷)

(اس نے کہا میرے بچو! مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا۔ بلکہ مختلف دروازوں سے جانا. مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا .حکم اس کے سوا کسی کا نہیں چلتا اس پر میں نے بھروسہ کیا پس جس نے بھروسہ کرنا ہو۔ اسی پر کرنا چاہیئے۔

۷۔ داعیٔ حق اپنے ارادے اور اپنے عزائم کی تفصیلات مخفی رکھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی غزوہ کے لئے نکلتے تو اس کا کہا یہ فرماتے اور کسی اور سمت کا ارادہ ظاہر فرماتے۔ ماسوا غزوۂ تبوک کے کہ فاصلہ زیادہ ہونے کی بنا پر آپؐ نے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا۔[۱]

---

[۱] : سیرت ابن ہشام۔ ج ۴ ، ص ۱۲۹

حصّہ دوم

استعانت بالغیر

اہل خیر سے استعانت

داعیٔ حق دعوت کو لوگوں تک پہنچا دینے کا مشتاق ہوتا ہے اس لئے وہ دعوت کے پہنچانے کے تمام شرعی ذرائع اختیار کرتا ہے اور شرعی ذرائع میں سے ایک ذریعہ اہل خیر سے مدد لینا بھی ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت موسیٰ کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ۝ ھٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝ کَیْ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا ۝ وَّنَذْکُرَکَ کَثِیْرًا ۝ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا۔ (طٰہٰ ۲۹، ۳۵)

"اور میرے لئے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے ہارون جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔ تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ بے شک تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے"

حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے درخواست کی کہ ان کی مدد اور استعانت کے لئے حضرت ہارونؑ کو مقرر کر دیا جائے تاکہ جو بات میں کہوں وہ اس کی تائید اور تصدیق کریں اور میرے کلمات دعوت کی فصاحت کے ساتھ توضیح و تشریح کریں۔

چنانچہ قرآن نے فرمایا۔

وَاَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْ

(القصص : ۳۴)

"اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے۔ اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے"

غرض داعی مسلم دوسرے ایسے مسلم افراد سے جو اعانت کر سکتے ہوں اور ان میں مدد دینے کی قدرت ہو استعانت سے گریز نہیں کرتا بلکہ دعوتی کاموں میں حصہ لینے والا کوئی فرد میسر آجائے اور کوئی دعوت کا اہل مل جائے تو اسے خوشی ہوتی ہے اور اگر اسے یہ خوشی حاصل نہ ہو تو اس کے اخلاص میں ریا اور شہرت کا شائبہ موجود ہے اور اسے اپنے اخلاص کے تنقیہ کی سعی کرنی چاہیئے اور دوسرے ایسے افراد کو کارِ دعوت کا موقعہ فراہم کرنا چاہیئے جو صدق و امانت اور اخلاص و دیانت کی صفات کے حامل ہوں۔

بغرض حمایت استعانت

داعیٔ مسلم کے لئے جائز ہے کہ لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے مسلمانوں کی حمایت اور مدد حاصل کرے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ایام قبائل عرب کے پاس جاتے انہیں اللہ کی جانب بلاتے، یہ بتاتے کہ وہ اللہ کے مبعوث کردہ نبی ہیں اور ان سے کہتے کہ وہ آپؐ کی تصدیق کریں اور آپؐ کی حفاظت کریں تاکہ آپؐ احکام الہیٰ کو بیان کر سکیں۔

آپؐ عرب قبائل کی فرودگاہوں پر تشریف لے جاتے اور فرماتے۔ اے لوگو! میں تمہارے پاس اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور اللہ کے ماسوا جن

چیزوں کی بندگی کرتے ہو ان کی بندگی ترک کر دو، میرے اوپر ایمان لاؤ۔ میری تصدیق کرو اور میری حمایت کرو تاکہ جو پیغام اللہ نے مجھے دے کر مبعوث فرمایا ہے میں اسے بیان کر سکوں[1]

بیعت عقبہ کبریٰ میں آپؐ نے فرمایا میں تم سے اس امر پہ بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔[2]

غیر مسلم سے استعانت

بسا اوقات داعیٔ حق کو ایذا پہنچانے والوں اور دعوت کے کام میں رکاوٹ بننے والوں سے تحفظ کے لئے غیر مسلم کی مدد لینی پڑ جاتی ہے تو کیا یہ جائز ہے اور اگر جائز ہے تو اس کی شرائط کیا ہیں؟ اور کیا غیر مسلم سے خاص کارِ دعوت میں بھی مدد لی جا سکتی ہے؟

داعیٔ مسلم کا اپنے تحفظ کے لئے غیر مسلم سے مدد حاصل کرنا

داعیٔ حق کا اپنے آپ کو ایذا رسانی سے محفوظ رکھنے اور کارِ دعوت کو جاری رکھنے کے لئے غیر مسلم سے مدد لینا جائز ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ یہ امر ثابت ہے کہ حضرت ابو طالبؓ رسول اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور حفاظت فرماتے تھے اور آپؐ کو قریش کی ایذا سے بچاتے تھے۔ اور آپؐ کی خواہش تھی کہ حضرت ابو طالب کا یہ مؤقف برقرار رہے اور وہ آپؐ کی حمایت ترک نہ کریں اور حضرت ابو طالب نے عملاً آپؐ کی حمایت ترک کرنے

---

[1]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۱ / ۲۲

[2]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۵۰۔

سے انکار فرما دیا اور قریش کی دھمکیوں پر اپنے ابن عم کو چھوڑ دینے پر تیار نہ ہوئے بلکہ بنی ہاشم اور بنی المطلب کو اپنے ساتھ آپؐ کی حمایت پر آمادہ کیا[۱]۔ اور جب حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف سے بہت سی تکالیف برداشت کیں یہاں تک کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ، ابوطالب کی وفات تک قریش مجھے ویسی اذیت نہ پہنچا سکے جیسی کہ وہ مجھے پہنچانا چاہتے تھے[۲] اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال کو جس میں حضرت خدیجہ اور حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا عام الحزن فرمایا۔[۳]

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے اور بنو ثقیف کی نصرت اور حمایت طلب کی اور انہیں دعوت دی[۴]

۳۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپسی میں حراء پر پہنچے آپؐ نے ایک شخص کو مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ وہ آپؐ کو پناہ دے تاکہ آپؐ اپنے رب کا پیغام پہنچا سکیں چنانچہ اس نے آپؐ کو پناہ دی[۵]

۴۔ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمان جب اس خبر کو سن کر واپس آئے کہ اہل مکہ اسلام لے آئے ہیں تو وہ چھپ کر اور پناہ حاصل کرکے آئے اور انہوں نے قریش کی ایذا رسانی سے محفوظ رہنے کے

---

[۱] : ابن ہشام ج ۲، ص ۲۸۱

[۲] : ابن ہشام ج ۲، ص ۲۲۶

[۳] : امتاع الاسماع ص ۲۷

[۴] : ابن ہشام ج ۲، ص ۲۸

[۵] : امتاع الاسماع ص ۲۸

لئے کسی نہ کسی کافر کی پناہ حاصل کی [۱]

۵۔ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی پناہ پیش کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور ابن الدغنہ نے یہ اعلان کیا کہ اے قوم قریش میں نے ابن ابی قحافہ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اب کوئی ان سے ماسوا خیر کے کوئی غلط برتاؤ نہ کرے۔ [۲]

غیر مسلم سے استعانت کے جواز کی وجہ

جو احادیث و روایات اوپر مذکور ہوئی ہیں ان سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم سے حمایت طلب کرنا اور قبول کرنا جائز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے لئے ایسی فضا اور ماحول کی ضرورت ہے جو ہر قسم کی رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے پاک ہو اور داعی کی شخصیت اور کار دعوت مخالفین کی زیادتیوں سے محفوظ ہو کیونکہ دعوت الی اللہ کی مثال زمین میں بیج بونے اور عمارت تعمیر کرنے کی سی ہے کہ سخت موسم میں بیج نہیں اگتا اور مزاحمتوں کی شدت اور تعمیر کرنے والوں کی اپنی حفاظت کی فکریں لگے رہنے سے عمارت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے بعد دعوت اسلامی کو ایک طرح کی اطمینانی فضا میسر آگئی تو اس صلح سے قبل تک جتنے افراد نے اسلام قبول کیا تھا اس سے زیادہ اس کے بعد اسلام میں داخل ہوئے۔ [۳]

بہر حال غیر مسلم کی اعانت کے قبول کرنے کا مقصود راحت و سکون حاصل کرنا اور کافروں سے مداہنت برتنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کا مقصود

---

[۱]: ابن ہشام ج ۱، ص ۲۸۸

[۲]: ابن ہشام ج ۱، ص ۳۹۶

[۳]: ابن ہشام ج ۲، ص ۲۷۸

دعوت اسلامی کی اشاعت اور اس کے لئے سازگار ماحول فراہم کرنا ہونا چاہیے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کافر مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں کو دور کردے یا ان کی حفاظت کرے اور ان کے راستے کی تکالیف دور کردے۔

غیر مسلم کی حمایت قبول کرنے کی شرائط

غیر مسلم کی حمایت طلب کرنے اور اسے قبول کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کے برخلاف نہ ہو اور اس سے کسی اسلامی اصول کا ترک لازم نہ آتا ہو، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوطالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ میری اور اپنی حفاظت کرو اور مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں، تو آپؐ نے فرمایا کہ چچا جان اگر لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں اس کام سے باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس امر کو ظاہر فرما دے یا میں اس کے راستے میں ہلاک ہو جاؤں، یہ فرما کر آپؐ آبدیدہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور جانے لگے اس پر ابوطالب نے فرمایا بھتیجے سنو، جو تم چاہو کہو میں تمہیں ہرگز کسی کے حوالے نہیں کروں گا[1]

اسی طرح جب ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ بنی جمح میں اپنے گھر کے دروازے کے پاس بنائی ہوئی اپنی مسجد میں نماز پڑھیں تو انہوں نے اس کی پناہ میں رہنے سے انکار کر دیا۔[2]

کافروں کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے غیر مسلموں کی پناہ لینا جائز ہے کیونکہ مسلمان کی زندگی مستقبل میں کارِ دعوت کو پھیلانے میں مفید ہوگی جیسا کہ

---

۱ : ابن ہشام ج ۲، ص ۲۷۸

۲ : ابن ہشام ج ۱، ص ۳۹۶

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اصحاب کو آزمائشوں میں مبتلا دیکھا اور آپ کو اللہ سبحانہ کی حفاظت اور حضرت ابوطالب کی نصرت حاصل تھی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو حبشہ چلے جاؤ، وہ سچائی کی سرزمین ہے اور وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں کرتا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی راستہ پیدا فرما دے[1]

دعوت سے متعلق معاملات میں غیر مسلم سے استعانت حاصل کرنا

داعی مسلم دعوت سے متعلق معاملات میں بھی غیر مسلم سے مدد حاصل کر سکتا ہے اگرچہ اس میں اپنے بعض امور سے اُسے آگاہ بھی کرنا پڑے۔ کیونکہ،

۱۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہجرت کے موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اس موقعہ کے لئے دو اونٹنیاں تیار کی تھیں ان کو عبداللہ بن اریقط کے اجرت پر سپرد کر دیتے ہیں اس نے حضرت سرکار دو عالمؐ اور حضرت ابو بکرؓ کو راستہ بھی بتلایا اور اونٹنیاں اپنے پاس رکھیں اور میعاد مقرر پہ لاکر سپرد کردیں[2]

۲۔ بیعت عقبۃ الکبریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ کے ساتھ حضرت عباس بن عبدالمطلب تھے، جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ مگر حضرت عباس اس بیعت کے موقعہ پہ آپؐ کی تائید اور توثیق کے لئے تشریف لائے[3]

---

[1] : ابن ہشام ج ۱، ص ۳۴۳

[2] : ابن ہشام ج ۲، ص ۹۸

[3] : ابن ہشام ج ۱، ص ۹۹

۳ - بنو خزاز کے مسلمانوں اور کافروں سے سرکار نے رازداری کا معاہدہ فرمایا چنانچہ یہ لوگ آپؐ سے کوئی امر مخفی نہ رکھتے تھے۔[1]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسلم داعی ان امور میں بھی غیر مسلم سے مدد لے سکتا ہے جو دعوت سے متعلق ہوں لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ داعی کو غیر مسلم پر بھروسہ اور اطمینان ہو کہ وہ خیانت نہیں کرے گا اور راز فاش نہیں کریگا۔

استعانت کے جواز کے بارے میں یہ واضح احادیث موجود ہیں اور اس بات کا تعلق داعی کی فہم اور معاملات کے صحیح اندازے اور درست ادراک سے ہے۔ اور غیر مسلم کی اِس رازداری برتنے کا تعلق اس امر سے ہے کہ داعیٔ مسلم یا تو اس کا رشتہ دار ہو، یا اس نے اس کے ساتھ کوئی حسن سلوک کیا ہو یا غیر مسلم یہ سلوک داعیٔ مسلم کے حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار کی بنا پر کرے جیسا کہ ابن الدغنہ نے حب حضرت ابو بکرؓ کو پناہ دی تو یہ کہا کہ

آپ تو زینت معاشرہ ہیں، آپ مصائب میں لوگوں کے کام آتے ہیں نیک کام کرتے ہیں اور ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔[2]

بہرحال غیر مسلم کسی بھی وجہ سے اگر داعیٔ مسلم کے ساتھ حسنِ ظن رکھے تو اس کی اعانت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] : ابن ہشام ج، ص ۴۵:

[2] : ابن ہشام ج ۱، ص ۳۹۶

تیسرا حصّہ

تنظیم

تنظیم کی اہمیت

جدو جہد کو نتیجہ خیز بنانے اور مساعی سے صحیح فوائد حاصل کرنے میں تنظیم ایک بہترین وسیلہ ثابت ہوتی ہے اور داعی کو اپنے ہدف تک پہنچنے کے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں، جبکہ عدم تنظیم کی بنا پر مساعی رائگاں ہو جاتیں اور جدو جہد بے کار ہو جاتی ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جس میں تنظیم کو بہت اہمیت حاصل ہے چنانچہ نماز میں ہم پہلو تنظیم ہے کہ وقت کے لحاظ سے بھی نماز منظم ہے اور ادائیگی کی صورت کے لحاظ سے بھی منظم ہے اسی طرح حج روزے اور زکوٰۃ عبادات ہیں، جن میں تنظیم موجود ہے۔

داعی کے لئے تنظیم کی ضرورت

داعیٔ مسلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوقات کار کو منظم رکھے کیونکہ وقت ہی سرمایۂ حیات ہے اس لئے داعی کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس حدیث کو اپنا شعار بنائے کہ : من استوی یوماہ فھو مغبون۔

'جس شخص کے دونوں دن برابر ہیں وہ گھاٹے میں ہے'

اس حدیث کی رو سے ضروری ہے کہ داعی کا اگلا روز اس کے گزشتہ دن سے بلحاظ خیر بہتر ہو یعنی کارِ دعوت کے لئے اس کی جدوجہد اور بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے اس کی مساعی گزشتہ ایام سے بڑھی ہوئی ہوں کیونکہ کسی انسان کو گمراہی سے نجات دلا کر راہِ حق دکھا دینا داعی کے حق میں تمام دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

داعی اپنے اوقات کی تنظیم اس طرح کر سکتا ہے کہ اپنے اوقات ہر کام کے لئے متعین کرے کہ کچھ اوقات اس کی اپنی ذات کے لئے ہوں کچھ اوقات اہل خانہ کے لئے ہوں اور کچھ اوقات عبادت اور کارِ دعوت کے لئے ہوں۔

داعی کے لئے لازمی ہے کہ بے فائدہ امور میں اپنے اوقات کو صرف نہ کرے اس لئے کہ فرائض و واجبات اوقات سے زیادہ ہیں اور موت کا اندیشہ ہر وقت موجود ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ کسی واجب مستحب یا مندوب کام میں گزارے

جماعتی تنظیم کی ضرورت۔

قرآن کریم میں دعوت الی اللہ کے لئے اجتماعی تنظیم کی جانب راہنمائی فرمائی گئی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران - ۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

اس آیت میں امت کے معنی جماعت کے ہیں اس لئے ایک جماعت کا کارِ دعوت کو انجام دینا لازمی ہے اگرچہ انفرادی طور پر بھی کارِ دعوت انجام دینا درست ہے۔ بہرحال اجتماعی طور پر دعوت کے کام کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اجتماعیت سے متعلق اسلام کے تنظیمی قواعد کو ملحوظ رکھا جائے اور ایسی دینی جماعتیں

تشکیل دی جائیں جو محاسن اسلام کی اشاعت کریں اور لوگوں کو امور دین اور عبادت کی تعلیم دیں۔

شریعت اسلامیہ میں اجتماعی تنظیم کے بارے میں راہنمائی

شریعت اسلامیہ میں اجتماعی تنظیم کے بارے میں بڑی راہنمائی ملتی ہے اور ایسی ہدایات موجود ہیں جن پر عمل کرنا لازمی ہے۔

۱۔ سب سے پہلی ہدایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ جماعت کا ایک سربراہ (امیر) ہونا چاہیئے کہ اس کی تائید شریعت سے بھی ہوتی ہے تجربہ بھی اس کا مؤید ہے اور عقل سلیم بھی اس کی متقاضی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ

'جب تین آدمی سفر کے لئے نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں'

اور ایک اور حدیث میں ہے کہ

'جائز نہیں ہے کہ تین افراد آبادی سے نکلیں اور ان کا کوئی امیر نہ ہو'

اس حدیث کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے چھوٹے سے اجتماع میں بھی امیر بنانا لازمی قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر جماعت کے لئے امیر کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ اللہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم فرمایا ہے اور اس فرض کی انجام دہی کے لئے بھی اجتماعی قوت اور امیر کا ہونا ضروری ہے [۱]

---

[۱]: مجموعہ فتاوی ابن تیمیہؒ ج ۲۸، ص ۳۹۰۔

امارت (امیر بنانے) سے مقصود اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے احکام کا نافذ کرنا ہے اور ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ امارت برائے دین اور برائے ثواب ہونی چاہیئے تاکہ اس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو سکے اور برائے مال و دولت اس منصب کی وجہ نہیں بننی چاہیئے[۱]

۲۔ بیعت عقبۂ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنے بارہ نمائندے میرے پاس بھیج دو تاکہ اپنی قوم پر راہنما بن سکیں[۲]

۳۔ آپؐ جب کسی غزوہ کے لئے مدینہ منورہ سے تشریف لے جاتے تو آپؐ اپنا نائب مقرر فرما جاتے۔

امارت سے مقصود

اجتماع قلیل کے لئے امیر یا رئیس منتخب کرنے کے افادیت یہ ہے کہ جماعت کے تمام امور ایک نہج پر استوار ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جماعت اپنے امیر کی اطاعت کرے چنانچہ حضرت عبادۃ بن الصامتؓ سے مروی ہے کہ آپ نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر پر بیعت کی کہ ہم تنگی اور فراخی اور خوشی اور غمی ہر حالت میں آپؐ کی اطاعت کریں گے، اہل لوگوں کے معاملے میں نزاع نہیں کریں گے اور بلا کسی ملامت کے خوف کے جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔[۳]

اطاعتِ امیر کا مقصود معروف کی اطاعت ہے اس لئے کہ معصیت

۱: مجموع فتاوی ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۲۹۱

۲: ابن ہشام، ج ۲، ص ۵۱

۳: ابن ہشام ج ۲، ص ۴۲

میں کسی کی اطاعت کسی مسلمان پر لازم نہیں ہے اس لئے کہ فرمان نبوتؐ ہے کہ
"خالق کی معصیت کی صورت میں کسی مسلمان پر کوئی اطاعت لازم
نہیں ہے"

اطاعت کی ضرورت

امیر کی اطاعت ہر عمل میں ضروری ہے اور اس جماعت کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے جو دعوت الی اللہ کے لئے برپا کی گئی ہو اور اقامت اسلام کے لئے وجود میں آئی ہو۔

اس حقیقت کو صحابۂ کرام بخوبی سمجھتے تھے چنانچہ جنگ خندق کے موقعہ پر جب خندق کھودی جا رہی تھی اس وقت اگر کسی صحابی کو کسی طبعی ضرورت کے لئے جانا ہوتا تو آپؐ سے اجازت لے کر جاتا بخلاف منافقین کے کہ وہ بلا اجازت یوں ہی کھسک جاتے تھے۔ اور صحابۂ کرام اپنے ناگزیر امور کے لئے اجازت لے کر جاتے اور واپس آکر اسی عمل خیر کو انجام دیتے جسے چھوڑ کر گئے تھے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں۔[1]

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور - ۶۲)

"مومن تو اصل میں وہی ہیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں۔ تو اُس سے اجازت لئے بغیر نہ جائیں

[1]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۷۰۔

اے نبیؐ جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں۔ وہی اللہ اور رسول کو ماننے والے ہیں۔ پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو۔ اللہ یقیناً غفورٌ رحیم ہے")

اطاعت و مشورہ

اطاعت کے لازم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امیر مشورہ ترک کر دے کیونکہ رسول اللہؐ بہت مشورہ فرمایا کرتے تھے اُس لئے مشورہ ضروری ہے اور ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور امیر کو چاہیئے کہ وہ اس رائے کو توجہ سے سُنے اور اگر درست مشورہ ہو تو اسے قبول کرے۔

روایت ہے کہ ۶ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کا ارادہ فرمایا تو قریش نے آپؐ کو روکنے کی تیاریاں شروع کر دیں اس پر آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت عمر بن الخطاب کو قریش کے پاس بھیجیں اور آپ جا کر انہیں بتلائیں کہ نبی کریم کا ارادہ صرف زیارت بیت کا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ کو معلوم ہے کہ قریش مجھ سے کس قدر دشمنی رکھیں اور اب مکہ میں بنی عدی کا کوئی ایسا فرد موجود نہیں ہے جو میری حفاظت کر سکے اس لئے مجھے قریش سے اپنی جان کا خطرہ ہے البتہ میرے خیال میں عثمان بن عفان زیادہ مناسب ہیں اور قریش پر وہ مجھ سے زیادہ بھاری ہوں گے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عثمان بن عفان کو ابوسفیان اور سرداران قریش کے پاس بھیجا کہ ان کو بتائیں کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت اور اس کی تعظیم

ؔلہ: السیاستہ الشرعیہ لابن تیمیہؒ ص ۱۲۹

کے لئے تشریف لا رہے ہیں [1]

کبھی فرد بھی وہ کام انجام دے سکتا ہے جو جماعت انجام نہیں دے سکتی۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ لبا اوقات افراد ایسا کام کر گذرتے ہیں جو جماعت کے لئے بھی مشکل ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بصیرؓ کا واقعہ اس امر کی نشاندھی کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابو بصیر اسلام لائے اور مسلمانوں کے پاس آئے کہ مسلمان قریش کی طرف سے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیں مگر معاہدہ کی بنا پر مسلمان ایسا نہ کر سکے اور ابو بصیر قریش کی گرفت میں آ گئے لیکن وہ ان کی قید سے نکل کر فرار ہو گئے اور قریش کے قافلوں کے راستے میں بیٹھ کر ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے لگے جس سے کافر سخت زچ ہوئے اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچا اور انہوں نے اکیلے کافروں کو مجبور کر دینے کا وہ کام سر انجام دیا جو مسلمانوں کی جماعت کے لئے بھی کرنا دشوار تھا۔

صحابہ کرام اس حقیقت سے آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ابو بصیر کی اس مفید حکمت عملی میں وہ بھی شامل ہو جائیں کیونکہ انہیں جماعت کے ساتھ رہتے ہوئے اجتماعی نظم کی پابندیاں قبول کرنا تھیں جبکہ ابو بصیر کے تنہا ہونے کی وجہ سے ان پر معاہدے کی قیود لازم نہ تھیں۔

اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے سلسلے میں مشرکین کی تیاری معلوم کرنے کے لئے حضرت خذیفہ بن الیمان کو بھیجا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے لئے ابو سفیان کو قتل کرنا ممکن تھا مگر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں کوئی نئی بات نہ کروں اس

---

[1]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۷۱

لئے میں نے یہ اقدام نہیں کیا۔

اجتماعی کار دعوت کے لئے تربیت ضروری ہے

اجتماعی کار دعوت کے لئے فہم و فراست باریک بینی اور صبر کی صفات ہونا لازمی ہیں نیز یہ کہ کار دعوت میں شریک افراد میں ضبط نفس، تواضع اور دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی خو ہو اور ان میں انا اور ترفع ذات نہ ہو بلکہ اجتماعی رائے کا احترام کرنے والے اور امیر کی بات ماننے والے ہوں

قرآن کریم کی آیت ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر سے ان امور کی جانب اشارہ ملتا ہے کیونکہ دعوت الی اللہ ہر مسلمان پر لازم اور فرض ہے اور انہی مفاہیم پر یہ آیات دلالت کرتی ہیں

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ-۷۱)

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں"

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (یوسف - ۱۰۸)

"کہہ دو کہ میرا راستہ یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔"

یعنی مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی جماعت ہو جو کار دعوت کی اجتماعی ذمے داریاں سرانجام دے لیکن چونکہ ہر مسلمان میں مذکورہ صلاحیتیں موجود نہیں ہوتیں اس لئے ہر مسلمان اس اجتماعی کار دعوت کا اہل نہیں ہوتا چونکہ جماعتی نظم کی بنا پر اسے کچھ سختی برداشت کرنا ہوگی اور کس قدر اس کی آزادی پر قدغن لگے گی کیونکہ بہرحال دوسروں کی اطاعت میں عاجزی

ضروری ہے اور کارِ دعوت میں اتباعِ امیر اور نظمِ جماعت کی پابندی ایسی ہے جیسی نماز میں امام کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح کا مسلمان انفرادی مسائل میں بہتر ثابت ہو سکتا ہے لیکن اجتماعی نظم میں اختلال کا سبب بنے گا کہ اس کا مزاج اور طبیعت جماعت کے دوسرے افراد پر اثر انداز ہوگی اور ان میں تشتّت اور تفرق پیدا ہوگا جس سے جماعت کے بارے میں غلط تاثر کو تقویت ملے گی ہوائے نفس کے تحت اختلافات ہوں گے اور دعاۃِ شر کا اجتماع ہو جائے گا جو اپنے نفس کو فراموش کر کے دوسروں کی اصلاح میں لگ جائیں گے۔

جماعتی نظم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بہت بڑی مشین ہو اور اس کے سارے پرزے ایک ساتھ حرکت کر رہے ہوں اور اس مشین کی ایک رفتار متعین ہو جس پر چلنا مفید ہو سکتا ہے اور اس کی خلاف ورزی نقصان دہ ہو اور اگر اس کا کوئی پرزہ حرکت نہ کرے تو وہ پوری مشین کی حرکت پر اثر انداز ہوتا ہو۔ اسی طرح اجتماعی نظم میں ہر فرد ایک پرزے کی طرح ہے کہ اس کو اجتماعی نظم کی پابندی لازمی ہے اور اگر وہ کسی کارِ خیر کی جانب جماعتی نظم کے برخلاف جائے گا تو اس سے اضطراب پیدا ہوگا اور نقصان ہوگا، باوجودیکہ اس کی نیت درست ہو اور اسے فائدے کی توقع ہو، کیونکہ دنیا میں نتائج اسباب کے تابع ہوتے ہیں

امیر کے فرائض

امیر جماعت کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں پر نرمی کرے اور ان کے ساتھ سختی اور درشتی سے پیش نہ آئے البتہ انہیں خلافِ شریعت کام کی ہرگز اجازت نہ دے اور ان کو اس امر کی اجازت نہ دے کہ وہ اپنی ہوائے نفس پر عمل کریں اور دین کے حکم کو نظر انداز کر دیں، اس لئے کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

وَلَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

وَمَنْ فِيْهِنَّ (المومنون - ۷۱)

"(اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا. تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا)"

اور فرمایا

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ

الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (الحجرات : ۷)

"(خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کریں۔ تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ)"

حضرت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امیر کو چاہیئے کہ افراد کار کی دنیا اور دین کی منفعت کو مدنظر رکھے اور ناگوار امور میں نرمی اختیار کرے۔

امیر کو چاہیئے کہ افراد جماعت کے عزم و ہمت کو قائم رکھے اور ان امور کو دور کرے جن سے ان کی ہمتیں پست ہوتی ہوں چنانچہ روایت ہے کہ جب خندق کے موقعہ پر مسلمان مدینہ منورہ میں محصور تھے اور بنو قریظہ کی عہد شکنی کی اطلاع آئی تو آپؐ نے سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور عبداللہ بن رواحہ کو اس خبر کی تحقیق کے لئے روانہ کیا اور فرمایا کہ اگر یہ خبر درست ہو تو آکر مجھے اشارۃً مبہم الفاظ میں بتا دینا میں سمجھ جاؤں گا اور اگر خبر غلط ہو تو اس کا لوگوں کے درمیان برملا اعلان کر دینا۔[1]

امیر کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ ہر کام اس شخص کو سپرد کر دے جو اس کی پوری قدرت رکھتا ہو اور اس باب میں اصول یہ فرمان الٰہی ہے۔

---

[1]: ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۷۶

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص : ۲۶)

"بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے۔ جو مضبوط اور امانت دار ہو"

قوت وصلاحیت بلحاظ عمل مختلف ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر شخص کی صلاحیتوں کے مدنظر اسے کوئی خدمت سپرد کی جائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکرؓ نے مشرکین سے جنگوں میں حضرت خالد کو امیر بنایا حالانکہ حضرت خالدؓ سے بربنائے تاویل ایسے اعمال بھی سرزد ہوئے جن سے آپؐ نے اظہار برأت فرمایا مگر آپؐ کو باقی رکھا، جیسا کہ بنی جذیمہ کے واقعہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا اے اللہ میں خالد کے اس فعل سے بری ہوں [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور عبداللہ بن زید جنہوں نے کلمات اذان کے بارے میں خواب دیکھا تھا، فرمایا کہ بلالؓ کی آواز تم سے زیادہ گونجدار ہے [۲]

یہ بھی درست ہے کہ امیر کسی کام کو حاضرین کے سامنے بیان کردے اور جو اپنے آپ کو اس کا اہل اور اس کی قدرت رکھنے والا پیش کرے اسے وہ کام سپرد کردے اور امیر اس کی مقدرت کا اندازہ کرکے اسے کام سپرد کردے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد کے موقعہ پر فرمایا کہ اس تلوار کا کون حقدار ہے؟ یہ سن کر کئی اشخاص کھڑے ہوگئے لیکن آپؐ نے ان کو نہیں دی، جب ابودجانہ کھڑے ہوئے تو آپؐ نے انہیں تلوار عطا فرمادی [۳]

---

[۱] : ابن ہشام، ج ۴، ص ۴۴

[۲] : ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۲۹

[۳] : ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۰

دوسرا مبحث

تبلیغ و دعوت کے ذرائع

تمہید

تبلیغ و دعوت کے تین ذرائع ہیں، زبانی تبلیغ، عملی تبلیغ اور داعیٔ حق کے مثالی سیرت و کردار کے ذریعے تبلیغ، ایسی سیرت و کردار جو لوگوں کے لئے نمونۂ عمل بن جائے۔

اب ہم تبلیغ کے ان تینوں ذرائع کو جدا جدا بیان کرتے ہیں۔

پہلا حصہ

زبانی تبلیغ

زبانی تبلیغ کی اہمیت

زبانی تبلیغ اور قولی دعوت بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ قرآن کریم جو تمام اصول ہائے دعوت کا سرچشمہ ہے اللہ سبحانہ، کا فرمان ہے جس کو روح الامین

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے اور اس کو لوگوں تک پہنچا کر فریضہ تبلیغ ادا کیا۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ

(التوبہ - ۶)

"اور اگر مشرکوں میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہیئے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنے رب کا پیغام زبانی پہنچایا چنانچہ اللہ سبحانہ نے آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپؐ لوگوں کو یہ حکم بتا دیجئے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف - ۱۵۸)

"اے محمدؐ کہو۔ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں"

نیز فرمایا

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (یونس ۱۰۸)

"اے محمدؐ کہہ دو۔ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے"

اسی طرح اللہ سبحانہ نے تمام انبیاء کو حکم دیا کہ وہ واضح قول کے ساتھ اپنے رب کے پیغام کو اپنی اقوام تک پہنچا دیں۔

چنانچہ فرمایا

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف : ۵۹)

"ہم نے نوح اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے سردارانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔

اور فرمایا

وَقَالَ مُوْسٰی یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الاعراف، ۱۰۴)

"موسیٰ نے کہا اے فرعون میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں"

غرض زبانی تبلیغ اور قولی دعوت ہی اصل ہے اس لئے داعیٔ حق کو کلمۂ حسنہ اور قول طیب کی دلوں پر مرتب ہونے والی تاثیر سے اعراض نہیں کرنا چاہیئے۔

زبانی دعوتِ حق کے اصول

زبانی دعوت کے لئے لازمی ہے کہ داعی ایسی واضح زبان میں گفتگو کرے جس میں کوئی ابہام اور خفا نہ ہو اور جو بخوبی سننے والے کی سمجھ میں آجائے۔ خود قرآن کریم نے اس اصول کی نشاندہی کی ہے کہ انبیاء کو انہی کی اقوام کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا گیا تاکہ وہ اس کو بخوبی بیان کریں اور دلائل سے اس کی وضاحت کریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔

(ابراہیم - ۴)

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے۔ تاکہ وہ انہیں اچھی طرح بات کھول کر سمجھائے"

اور فرمایا

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النور - ۵۴)

"رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ صاف صاف حکم پہنچا دے"

وضاحت اور فہم کا معیار یہ نہیں ہے کہ داعی اسے واضح اور قابل فہم سمجھے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس کلام کو اور جس بیان کو داعی قابل فہم اور واضح خیال کر رہا ہے مخاطبین کے لحاظ سے وہ قابل فہم اور واضح نہ ہو، نیز وضاحت اور فہم کا یہ معیار بھی نہیں ہے کہ وہ خود ہی واضح ہو بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ وہ مخاطبین کے لئے واضح اور ان کے لئے

قابل فہم ہو، چنانچہ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم - ۴)

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا۔ اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا تاکہ انہیں اچھی طرح بات کھول کر سمجھائے۔"

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے بیان فرمایا کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام واضح ظاہر اور مفصل ہوتا اور ہر سننے والا بخوبی اس کو سمجھ لیتا"

یہ بھی ضروری ہے کہ داعی کے کلام میں ایسے نت نئے الفاظ استعمال میں نہ آئیں جن کو حق و باطل اور درست و نادرست پر محمول کیا جا سکے بلکہ داعی کو چاہیئے کہ وہ ایسے واضح شرعی الفاظ استعمال کرے جو قرآن اور سنت میں آئے ہیں جن کے معنی متعین ہوں، جن کا مفہوم بالکل عیاں ہو اور جو مخاطب دعوت کے ذہن میں موجود ہر باطل مفہوم اور غلط تصور سے پاک ہوں۔

قرآن کریم نے اسی منہاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا (البقرہ-۱۰۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ راعنا نہ کہو۔ بلکہ انظرنا کہو"

راعنا کے لفظ کے استعمال سے اس لئے منع کیا گیا کہ یہودیوں کے یہاں اس کا برا مفہوم تھا اور جب وہ آپؐ کو اس لفظ سے مخاطب کرتے تو یہی مفہوم ان کے ذہن میں ہوتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مسلمان اس لفظ کے بجائے انظرنا کہا کریں تاکہ یہود ان کے الفاظ کے دلیل بنا کر انہیں آپؐ کو برا بھلا کہنے کی گنجائش نہ نکال لیں، اور اگر ضرورتاً داعی کوئی نیا لفظ استعمال کرے تو اس کے مفہوم کی وضاحت کر دے تاکہ کسی مخاطب کا ذہن اس کے غلط مفہوم کی جانب منتقل نہ ہو۔

بیان کرنے والے اور حق بات کہنے والے کیلئے اصول

داعیٔ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر بیان کرے تاکہ مخاطب اس کے کلام کو بخوبی سمجھ لے چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ فرماتے تاآنکہ اس بات کو بخوبی سمجھ لیا جاتا۔[1]

داعی کو چاہیئے کہ وہ تصنع اور بناوٹ کے ساتھ اور اپنی بڑائی کے اظہار کے بڑے بڑے الفاظ استعمال نہ کرے اور مصنوعی طرز پر خطاب نہ کرے کیونکہ ارشاد نبوت ﷺ ہے۔

'مصنوعی باتیں کرنے والے ہلاک ہو جائیں'

آپ ﷺ نے یہ ارشاد تین مرتبہ فرمایا۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

'تم مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور روز قیامت مجھ سے سب سے زیادہ دور یاوہ گو، لوگوں پر اپنی برتری جتا کر بات کرنے والے اور اپنی بڑائی میں لمبی لمبی باتیں کرنے والے لوگ ہیں'۔[3]

داعیٔ حق کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو مخاطبین سے بلند مرتبہ تصور کرنے اور اپنی علمی فضیلت بیان کرنے اور اس پہ چیلنج کرنے سے احتراز کرے اور مشفق و مخلص ناصح کی طرح عاجزی اور تواضع کے ساتھ گفتگو کرے اور اپنے علم و فضل کے اظہار کے بجائے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

---

[1] : ریاض الصالحین، ص ۲۹۶

[2] : تیسیر الوصول ج ۲، ص ۳۱۷

[3] : ریاض الصالحین، ص ۲۷۴

ان امور کا لحاظ داعی کے لئے بے حد ضروری ہے کیونکہ ان کا لحاظ رکھے بغیر اس میں اور مخاطب دعوت میں وہ قلبی تعلق قائم نہیں ہوگا جو قبول حق کا باعث بنتا ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر داعی ان امور کو ملحوظ رکھے بغیر دعوت دے تو دعوت کا مخاطب پر کوئی اثر نہ ہو اور وہ داعی سے اور اس کی دعوت سے بیزار ہو جائے۔

داعئ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ نرم دم گفتگو ہو اور اپنے کلام اور خطاب میں ایسے موزوں اور مؤثر الفاظ استعمال کرے جو مخاطب دعوت کے دل میں گداز پیدا کریں اور جہالت اور دعوت سے بیزاری کے رجحان کو مٹا ڈالیں۔

قرآن کریم میں نرم دم گفتگو کے بارے میں ہمیں متعدد اشارے ملتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کو نقل کیا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (مریم: ۴۲)

"جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ سنتی ہیں۔ نہ دیکھتی ہیں۔ اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں"

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے بڑا نرم اور لطیف خطاب فرمایا اور اے میرے ابا جان کہہ کر انہیں پکارا تاکہ والد کے قلب میں بھی بیٹے کے لئے گداز پیدا ہو اور انہیں احساس ہو کہ ان کا بیٹا انہی کے بھلے کی بات کہہ رہا ہے اس لئے ذرا اس کی بات تو سن کر دیکھی جائے۔

اسی طرح حضرت ہودؑ نے اے میری قوم کہہ کر اپنی قوم کو مخاطب کیا، اور فرمایا۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (الاعراف: ۶۵)

"اور عاد کی طرف ہم نے اس کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا اے سرداران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں"

غرض حضرت ہودؑ نے بھی اپنی قوم کو میری قوم کہہ کر مخاطب کیا تاکہ وہ اس دعوت پر خوشدلی سے لبیک کہیں اور یہ محسوس کریں کہ داعی انہی میں سے ایک فرد ہے اور وہ ان کی خیر اور بھلائی کا خواہاں ہے ۔

سنت نبویؐ سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ابن ہشام نے اپنی سیرت نبویؐ میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریمؐ بنو کلب کے ایک قبیلے کے پاس تشریف لائے جنہیں بنو عبد اللہ کہا جاتا تھا، اور آپؐ نے انہیں دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے باپ کا نام خوب رکھا ہے[1] یعنی جس طرح تمہارے نام اچھے ہیں اسی طرح قبول دعوت میں بھی سبقت ہونی چاہیئے اور اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا چاہیئے۔

اس اساس پر داعی کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے خطاب میں مخاطبین دعوت کی ہمتوں کو ابھارے اور ان کی شرافت نسب اور نجابت عائلی کا ذکر کرے اور انہیں بتائے کہ یہ شرافت و نجابت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رذائل اور گناہوں سے اجتناب کریں اور گنہگاروں کی معیت نہ اختیار کریں اور یہ کہ ان کے لئے ضروری یہ ہے کہ وہ اللہ کے مطیع ہو جائیں ۔

داعی حق ان امور کو لوگوں کو اشتیاق دلانے کے لئے اختیار کر سکتا ہے لیکن ان میں مبالغہ نہ کرے اور انہیں مداہنت اور نفاق کی حدود میں داخل نہ ہونے دے۔

بہر حال نرمؔ دم گفتگو کا مقصود مداہنت اور منافقت نہیں ہے بلکہ قبول حق کے لئے مخاطب دعوت کو آمادہ کرنا اور اس کو قبول حق کی جانب آمادہ کرنا ہے، کیونکہ داعیٔ حق طبیب کی طرح ہے کہ جس طرح طبیب مریض کے مرض جسمانی سے واقف اور اس کے علاج سے باخبر ہوتا ہے اسی طرح داعی حق مریض روحانی کے مرض اور اس کے علاج پر مطلع ہوتا ہے اور ان کو اس مرض کے علاج

---

[1] ۔ سیرت ابن ہشام : ج ۲ ، ص ۳۳

کے فوائد تبلاتا ہے جیسا کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا ۔

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ (ہود : ۵۲)

"اور اے میری قوم کے لوگو اپنے رب سے معافی چاہو۔ پھر اس کی طرف پلٹو وہ تم پر آسمان دھانے کھول دے گا۔ اور تمہاری موجود قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر منہ نہ پھیرو"

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء : ۱۵۰-۱۵۲)

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے"

خطاب و بیان کی اقسام

زبانی تبلیغ دعوت کی متعدد صورتیں ہیں

خطبہ (تقریر) درس گفتگو علمی بحث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بیان اور تحریر (تحریر بھی بیان و خطاب کی ہی ایک صورت ہے)

خطبہ (تقریر)

یہ تبلیغ کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ خطاب ایسے افراد کو ہوتا ہے جن کو داعی حق نہ جانتا ہو یا ان میں سے بعض کو جانتا ہو اور کامیاب خطاب کے لئے ضروری ہے کہ داعی کچھ ایسے اہم مفاہیم بیان کرے جس کی جانب لوگ متوجہ ہو سکیں اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ خطاب میں حاضرین کے حالات کے

پیش نظر اسلامی عقائد کی توضیح کی جائے، مثلاً اگر مخاطبین میں قبائلی عصبیت پائی جاتی ہو تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کے مفاسد بیان کئے جائیں اور یہ کہ مومن کو دوسرے کی مدد حق کے ساتھ کرنی چاہیئے، اور یہ کہ مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اسلام پر راضی رہے اور جاہلی عصبیت سے چھٹکارا حاصل کرے۔

خطیب درج ذیل امور کا خیال رکھے۔

۱۔ قرآن اور احادیث سے دلائل دے اور دور نبوتؐ کے عمل سے استشہاد کرے اور عمل صحابہ کو بطور نمونہ پیش کرے تاکہ سیرت نبویؐ اور عمل صحابہ سے آیات و احادیث کی پوری طرح وضاحت ہو جائے۔

۲۔ قرآن و سنت میں وارد قصص سے استدلال کرے اور واقعات اور ضرب الامثال کی صورت میں مفاہیم اسلام کی وضاحت کرے جیساکہ حدیث میں یہ مثال آتی ہے کہ

آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمہارے گھر کے دروازے پر کوئی نہر ہو اور کوئی شخص اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہ جائے گا صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ، نہیں، اس پر آپؐ نے فرمایا نماز کی یہی تاثیر ہے۔

۳۔ خطبہ طویل نہ ہو اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ

نماز کا لمبا کرنا اور خطبہ کا مختصر کرنا تفقہ کی علامت ہے اس لئے نماز طویل کرو اور خطبہ مختصر کرو[۱]

یہ ارشاد آپؐ نے خطبۂ جمعہ میں ارشاد فرمایا تھا اس لئے اسی پر تمام تقاریر کو قیاس کیا جائے گا الا یہ کہ کسی موقعہ پر طویل تقریر کی کوئی ناگزیر ضرورت موجود ہو۔

---

۱ : ریاض الصالحین، ص ۲۹۷

۴۔ خطاب بکثرت نہ کرے کہ کہیں لوگ اکتا نہ جائیں اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابووائل شفیق بن سلمہ نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو ہمیں نصیحت فرماتے تھے کسی نے کہا کہ اے ابوعبداللہ اگر آپ روزانہ نصیحت فرمائیں تو میرا خیال ہے کہ بہتر ہو، آپ نے فرمایا مجھے تامل ہے کہ کہیں تم اکتا نہ جاؤ۔ میں تمہیں وقفہ وقفہ سے اس لئے نصیحت کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اکتا جانے کے اندیشہ کے پیش نظر ہمیں وقفہ وقفہ سے نصیحت فرمایا کرتے تھے۔

۵۔ یہ کہ داعی کا کلام واضح اور سادہ ہو کیونکہ تمام سامعین یکساں علمی صلاحیت کے حامل نہیں ہوتے اور ان کا علمی معیار اور قوت فہم یکساں نہیں ہوتی اگر داعی حق چھوٹے چھوٹے فقروں میں سادہ اور واضح بات کہے گا تو اسے سب سمجھ سکیں گے۔

۶۔ داعی اپنے خطاب کا آغاز اللہ سبحانہ کے ذکر اور ان کی قدرت کے بیان سے کرے اور خطبہ میں مقابلہ بازی اور مناظرہ نہ کرے، اور نہ ہی لوگوں کی ستائش کی فکر کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں کہ کس قدر قادر الکلام خطیب ہے۔ اس کے پیش نظر صرف دعوت الٰہی ہو اور جب وہ محسوس کرے کہ کہی ہوئی بات کو دوبارہ کہنا چاہیئے تو اسے دوبارہ کہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی دعوت دیا کرتے تھے کہ ایک اللہ کی بندگی کرو اور اس کے سوا سب کو چھوڑ دو اسی طرح آپؐ مسلمانوں سے خطاب کے موقعے پر مسلمانوں کو نصیحت کرتے کہ وہ تقویٰ پر کاربند رہیں اور آخرت کے لئے عمل کریں قرآن کریم میں بھی حضرت موسیٰؑ کا واقعہ متعدد بار آیا ہے اور بہت سے عقائد اور اصولی امور کی بار بار

وضاحت کی گئی ہے۔

۷۔ بہتر یہ ہے کہ خطیب اپنی تقریر کا آغاز کسی واقعہ یا کسی قصہ یا اپنے دل میں آنے والے کسی خیال سے کرے اور جب سامعین پوری طرح متوجہ ہو جائیں تب اصل موضوع کا خوب تفصیل سے اور اچھی طرح بیان کرے جس میں لوگوں کو اعمال حسنہ کا شوق بھی دلائے اور برے اعمال سے ڈرائے

۸۔ داعئ حق پہلے یہ اندازہ لگائے کہ مخاطبین کو کس طرح کے موضوع کی ضرورت ہے اور یہ کہ کون سی روحانی بیماری ان پر غالب ہے، وہ اسے عقیدۂ اسلامی سے مربوط کر کے بیان کرے اور یہ بتلائے کہ ان کی بداعمالی شریعت اسلامیہ کی کس درجے کی خلاف ورزی ہے اور اس موضوع کو آیات قرآنی اور احادیث سے واضح کرے اور تخویف و ترہیب سے کام لے اور انہیں خوف دلائے کہ آرزوؤں میں پڑے رہنا باعث ہلاکت ہے اصل چیز آخرت کی تیاری ہے اور یہ کہ آخرت کے لئے تقوی کا زاد راہ لازمی ہے۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرہ : ۱۹۷)

سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔

لذت گناہ وقتی ہے اور اس کی ندامت اور اس کا عذاب طویل ہے، عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کو لذت حرام سے روکے اور دائمی عذاب سے بچائے۔

جب داعئ حق یہ محسوس کرے کہ مخاطبین میں مایوسی اور قنوطیت پائی جاتی ہے اور وہ رجوع الی اللہ کو دشوار سمجھ رہے ہیں تو وہ ان کو اللہ کی رحمت یاد دلائے اور بتلائے کہ اللہ پاک ان کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (الزمر : ۵۳)

گرفت سے نکل جاتا ہے۔

قرآن کی تفسیر بیان کرتے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرے کہ جو امر قرآن میں ایک مقام پر مجمل ہوتا ہے وہ دوسرے مقام پر واضح ہو جاتا ہے، اس کے بعد مضمون کی تشریح حدیث کے ذریعے کی جائے اور اس کے بعد اقوال مفسرین بیان کرے، یہی طریقہ حدیث کے بیان میں اختیار کرنا چاہیئے۔

فقہ اسلامی کے بیان کے وقت مستحسن یہ ہے کہ راجح فقہی اقوال اور مرجوح اقوال کا فرق بیان کرے اور راجح حکم فقہی کی تفصیلات پر روشنی ڈالے اگر اس قدر قدرت نہ ہو تو کسی ایک مسلک کے مطابق حکم بیان کر دے اور فقہی اختلافات کو بیان نہ کرے۔

لیکچر

لیکچر ایک متعین موضوع پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اس موضوع کے تمام دلائل بیان کئے جاتے ہیں اور جو کچھ اس موضوع پر کیا گیا ہے اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اور ان میں سے درست اقوال ذکر کئے جاتے ہیں اور ان کی وضاحت کرکے اصل موضوع کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

لیکچر دیتے وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ جزرس ہو اور اس میں زائد از ضرورت اور جذباتی گفتگو نہ ہو، کیونکہ جذباتی طرز گفتگو تقریر میں ہوتا ہے لیکچر میں نہیں ہوتا۔

لیکچر کی ایک ضرورت یہ ہے کہ موضوع کے مقدمات اور اس کے نتائج میں سامعین کو شریک رکھا جائے تاکہ جن نتائج پر لیکچر منتج ہوا سامعین بھی ان

نتائج تک پہنچ سکیں۔ علاوہ بریں یہ کہ جو امور بیان کئے جائیں وہ واضح اور یقینی ہوں اور دقیق اور مشتبہ مسائل سے اجتناب کیا جائے اور فلسفیانہ مضامین کے بیان سے گریز کیا جائے۔

مثلاً اگر بعث بعد الموت کے عقیدہ کا بیان مقصود ہو تو مناسب یہ ہے کہ زندگی میں رونما ہونے والے موت وحیات کے واقعات کو بطور مثال بیان کیا جائے جس طرح قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (فصلت: ۳۹)

(اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین سوئی پڑی ہے پھر جونہی کہ ہم اس پر پانی برسایا یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے")

یعنی یہ کہ موت کے بعد زندگی کے اثرات مشاہدے میں آتے ہیں کہ بنجر زمین ہوتی ہے جس میں کوئی گھاس سبزہ نہیں ہوتا، اللہ اس پر آسمان سے پانی برساتا ہے، وہ زمین لہلہا اٹھتی ہے جس سے اس میں سے رنگا رنگ پھل پھول اور پودے اور نوع بنوع غذائیں پیدا ہو جاتی ہیں، جس اللہ نے اس مردہ زمین میں جان ڈالی ہے اس نے انسان کو عدم سے وجود بخشا ہے اور وہی مردہ انسان کو دوبارہ زندہ کر دے گا کیونکہ بالکل عدم سے کسی شے کو موجود کر دینے سے اس کا دوبارہ اعادہ سہل تر ہے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ

(یٰس: ۷۸)

(اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے، کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں، اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

داعیٔ حق کو اپنے اس خطاب میں چاہیئے کہ ترش بیانی سے احتراز کرے اور جوشِ ایمانی کو تحریک دے کر ایمانی عقائد کو بیان کرے۔

بحث ومناظرہ

بحث ومناظرہ دو یا زیادہ افراد کے درمیان ہوتا ہے اور اس میں ہر فریق اپنی رائے اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ اور جب داعی مخاطب دعوت کو اللہ کی جانب بلاتا ہے اور وہ حق کو قبول نہیں کرتا اور داعی سے بحث اور مناظرہ پر تیار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے گزشتہ انبیاء اور ان کی اقوام کے درمیان ہونے والے مناظروں کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (الاعراف: ۵۹)

(ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اس نے کہا اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں، اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا، ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں

مبتلا ہو، نوح نے کہا اے برادران قوم میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے۔)

مخاطب دعوت بعض اوقات داعی حق سے بحث و مناظرہ کرتا ہے اور خود داعی کو گمراہ قرار دیتا ہے لیکن اس طرح کی صورت حال میں بھی داعی کو سکون و اطمینان اور مخاطب پر شفقت اور نرمی ترک نہ کرنا چاہیئے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں حضرت نوحؑ کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔

داعیٔ حق کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ تواضع اور نرمی سے لوگوں سے پیش آئے، پاکیزہ اور شائستہ گفتگو کرے، خوش خلقی کے ساتھ مخاطب کو سمجھائے، مخاطب کو برا بھلا نہ کہے بلکہ ہر حال میں ایک داعی کے مقام اور مرتبہ کو ملحوظ رکھے اور کسی بھی صورت میں مخاطب سے سختی و درشتی اور استہزاء کے ساتھ پیش نہ آئے۔ لیکن دعوت حق پوری قوت کے ساتھ پہنچائے اور حق کی خوب اچھی طرح وضاحت کرے۔

جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۵)

(اے نبی) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو)

اگر اس تبلیغ حق کے باوجود مخاطب اپنے باطل پر مصر رہے اور حق دشمنی پر جما رہے تو پھر داعی کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اس سے مزید بحث نہ کرے،

کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ

(یونس : ۱۰۸)

"اے محمد کہہ دو کہ لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے، اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لئے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اس کے لئے تباہ کن ہے۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔"

اور فرمایا

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

(الکہف : ۲۹)

"صاف کہدو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے"

حق دشمنی پر جمے رہنے والوں اور باطل پر اصرار کرنے والوں سے بحث و مناظرہ کا سلسلہ بند کر دینا ہی زیادہ موزوں ہے اس لئے کہ ایسے لوگ حق تک پہنچنا نہیں چاہتے بلکہ کبر، عناد اور انکار کی روش پر چلنا چاہتے ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (الانعام : ۷)

"اے پیغمبر، اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے، تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے"

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اکثر زبان سے ادا کیا جاتا ہے اور کبھی غیر مسلم کو اسلام کی جانب دعوت دے کر بھی یہ فریضہ ادا ہوتا ہے اور یہ بھی صورت ہے کہ گناہ گار مسلمان کو گناہوں کو ترک کرنے اور اطاعت کی روش اختیار کرنے کی نصیحت کی جائے۔

امر و نہی کی ان اقسام کا مخاطب فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور ایک جماعت بھی ہو سکتی ہے اور اسلام کے جملہ احکام کی اتباع اور تمام نواہی سے اجتناب کی دعوت عام بھی دی جا سکتی ہے۔

بہر حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق اصول حسب ذیل ہیں جو داعی کو سمجھنے چاہئیں

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول

پہلا اصول :-

ضروری ہے کہ داعی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا علم ہو جیسا کہ حکیم یا طبیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ مریض کے مرض سے بخوبی واقف ہو اور اس مرض کی دوا کا بھی اسے علم ہو، قرآن کریم کی یہ آیت اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ یہاں پر بصیرت کے لفظ میں علم و فہم داخل ہیں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

(یوسف ۱۰۸)

(تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی)

دوسرا اصول :۔

داعیٔ حق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نرمی اختیار کرے کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

(طہٰ : ۴۳، ۴۴)

(جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔)

نرم قول کی جانب دوسرے مقام پر اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى

(النازعات : ۱۸، ۱۹)

(اس سے کہہ کہ کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو)

کس قدر صریح اور واضح بیان ہے لیکن اس میں نرمی اور رفق ہے اور اس طرح کا کلام ہے جو سننے والے باطل پرست کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرے گا، اس سے بھی زیادہ نرمی حضرت موسیٰؑ کے اس کلام میں ہے۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۔

(طہٰ : ۴۸)

(ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے)

یہ بڑی لطیف تحویر ہے اور اس میں براہ راست فرعون کو مخاطب کرنے کے بجائے عمومی انداز بیان اختیار کر کے فرمایا ہے علیٰ من کذب وتولیٰ۔ یعنی یہ قول اپنی لطافت کی بنا پر نرمی پر مشتمل ہے۔

اللہ سبحانہ' نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کا حکم دیا جبکہ حضرت موسیٰ نبی معصوم تھے اور آپ سے بہتر کوئی داعی اور فرعون سے زیادہ براکوئی مخاطب دعوت نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر داعی پہ لازم ہوا کہ وہ نرمی اور رفق اختیار کرے۔

سنت نبویؐ میں فرمان ہے کہ

جس شے میں نرمی ہوگی اور وہ خوب ہو جائیگی اور جس میں سختی ہوگی وہ بری ہو جائے گی۔

اور فرمایاؐ کہ

'اللہ سبحانہ' ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں اور نرمی کے معاملے میں وہ کچھ عطا فرماتے ہیں جو کہ سختی کے معاملے میں نہیں فرماتے'

ظاہر ہے کہ جس نرمی اور رفق کا حکم دیا گیا ہے اس میں دعوت حق، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نرمی اور رفق بھی شامل ہے، اور داعیٔ حق کو چاہیئے کہ وہ دعوت کے ہر مرحلے میں نرمی اور رفق کو ملحوظ رکھے کیونکہ یہی درست طریقہ ہے اور اسی پر ہمارے نبیؐ نے عمل فرمایا ہے چنانچہ معاویہ بن حکم السلمی سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص کو چھینک آئی، میں نے یرحمک اللہ کہا لوگوں نے مجھے گھور کر دیکھا، تو میں بول پڑا کہ تم مجھے گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو، اس پر لوگ اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے، جب میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کرانا چاہتے ہیں تو میں خاموش ہو گیا، جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے، میرے والدین آپ پر قربان میں نے آپؐ سے قبل اور آپؐ کے بعد آپؐ سے بہتر کوئی معلم نہیں دیکھا، آپؐ نے غضبناک ہوئے نہ مجھے مارا اور نہ برا بھلا کہا، بلکہ فرمایا کہ نماز میں صرف تسبیح اور تکبیر ہوتی ہے اور قرآن کی تلاوت ہوتی ہے اور اس میں لوگوں کی آپس

کی باتیں نہیں ہوتیں۔[1]

تیسرا اصول

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصالح اور مفاسد پر پوری طرح نظر رکھتا ہو۔ اور اس امر کا اسے مکمل ادراک ہو کہ کس امر پر وہ قادر ہے اور کس پر وہ قادر نہیں ہے اور کس مسئلہ میں مصالح زیادہ ہیں اور کس میں مفاسد کا پہلو زیادہ ہے، اگر امر و نہی میں مصالح زیادہ ہوں تو اس پر امر و نہی فرض ہے اور اگر مفاسد زیادہ ہوں تو اس پر امر و نہی حرام ہے۔[2]

چوتھا اصول

معروف کی تمام انواع کے پیش نظر داعی کو چاہیئے کہ وہ معروف کی مطلقاً دعوت دے اور اسی طرح منکر کی جملہ اقسام کے پیش نظر منکر کی عموماً ممانعت کرے اور اگر کسی جماعت یا معاشرے میں ایسی صورت ہو کہ معروف و منکر اس طرح ملے جلے ہوں کہ یا تو لوگ ان سب کو قبول کریں گے یا ان سب کو ترک کر دیں گے تو داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اگر معروف میں مصلحت زیادہ ہو اور وہ راجح ہو تو اس کا حکم دے اگرچہ اس خیر کثیر میں تھوڑا سا منکر بھی ملا ہوا ہو۔ اور اگر داعی پر یہ معاملہ مشتبہ ہو تو توقف اختیار کرے تا آنکہ اس کے سامنے صورت حال واضح ہو جائے اور وہ علم و اخلاص کے ساتھ قدم اٹھا سکے۔

پانچواں اصول

جہاں تک ممکن ہو تبلیغ دین کرتا رہے اور حسب استطاعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہر مکلف انسان

---

[1]: ریاض الصالحین، ص ۹۷، ۲۹۸/۲ [2] مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ، ج ۲۸، ص ۱۲۸۔

تک دین کے احکام پہنچا دے، بلکہ ضروری یہ ہے کہ مکلفین کی اس کی تبلیغ کی وجہ سے اس دین حق تک رسائی ہو جائے اس کے بعد اس کے اختیار کرتے ہیں ان کی جانب سے جو کچھ کوتاہی ہو گی داعی اس کا ذمے دار نہ ہو گا۔ [1]

تحریر

قلم و تحریر کے ذریعے دعوت الی اللہ دعوت کی ایک قولی قسم ہے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ داعی جن کو دعوت حق دینا چاہتا ہے انہیں خطوط لکھے، کتابیں اور مضامین تحریر کرے اور اس طرح دعوت الی اللہ کے فرائض انجام دے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم حکمرانوں کو دعوت اسلام پر مشتمل خطوط تحریر فرمائے اور عراق کے کسری شام کے ہرقل، اور مصر کے مقوقس کو خطوط لکھے۔ اور علمائے کرام مسلمان حکمرانوں کو نصیحت و موعظمت پر مشتمل خطوط لکھتے رہے۔ مثلاً امام اوزاعیؒ نے شام کے عباسی والی کو ذمیوں کے حقوق کے بارے میں خط لکھا۔

اسلامی مفاہیم پر تصانیف اور بحثیں اور مقالات تحریر کرنا بھی دعوت کا ایک بہت عمدہ طریقہ ہے اور دین اسلام پر مشتمل تصانیف کو دنیا کی زبانوں میں منتقل کر کے شائع کرنا کار دعوت کے لئے بے حد مفید ہے کہ اس طرح لاکھوں انسانوں تک اسلام کی تعلیمات پہنچ سکتی ہیں۔

اسلام پر تصانیف مرتب کرنے اور دعوتی مقالات تحریر کرنے میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ان تحریروں کی زبان سہل ہو اور ان کو لوگ بخوبی سمجھ سکیں اور ان کا مفہوم بڑا واضح اور جلی ہو کہ ہر معیار کے فہم و ادراک کی صلاحیت رکھنے والے افراد ان سے مستفید ہو سکیں۔

---

[1] مجموع فتاوی ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۲۵، ۱۲۶

دوسرا حصّہ

عمل کے ذریعے تبلیغ

عمل کا مقصود

عمل سے ہماری مراد منکر کو عملاً مٹا دینا ہے اور کسی معروف کو عملاً قائم کر دینا ہے مثلاً مسجد تعمیر کرنا، مدرسہ بنانا یا اسی قسم کا کوئی اور کام کرنا جس سے کسی نہ کسی پہلو میں اللہ کی شریعت متحقق ہو جائے اور یہ کام اسلام کی ایک خاموش دعوت کے طور پر انجام دیتے جائیں اور دعوت الی اللہ کے مؤثر ذریعے کے طور پر کئے جائیں۔

ازالۂ منکر کے عام اصول

ازالۂ منکر میں عام اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ تم میں سے جب کوئی شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے برا کہے اور اگر اس کی قدرت نہ ہو دل سے برا سمجھے جو کہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے،

منکر کو عملاً مٹا دینے کی صورت یہ ہے کہ جو فعل حق اور خیر سے مانع ہو اسے دور کر دیا جائے کہ اس کے مٹا دینے سے لوگوں کے لئے حق اور خیر کا راستہ آسان ہو گا اور اس سے امر بالمعروف کی عملی تدابیر بروئے کار آئیں گی۔

ہم عمومی اصول پہلے ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں وہی اصول یہاں بھی کارفرما ہوں گے یعنی یہ کہ داعی عالم ہو اور تفقہ کا حامل ہو اور اسے

یہ ادراک ہو کہ کسی طرح منکر کا ازالہ کیا جائے اور یہ کہ وہ رفق و نرمی برتے کہ اس کا مقصود انتقام نہیں ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا، لوگ اسے پکڑنے اٹھے تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی ڈالدو کیونکہ تمہیں (امت مسلمہ) کی آسانی پیدا کرنے کے لئے مبعوث کیا گیا ہے سختی کرنے کے لئے نہیں مبعوث کیا گیا ہے۔

ازالۂ منکر سے پہلے ضروری ہے کہ داعی مصالح اور مفاسد پر نظر رکھے اور اگر یہ صورت ہو کہ معروف و منکر اس طرح جمع ہوں کہ کوئی شخص یا افراد دونوں کو ساتھ کریں یا دونوں کو چھوڑ دیں تو اس کا بھی لحاظ رکھے۔

اب ہم ازالۂ منکر کے کچھ عمومی اصول بیان کرتے ہیں۔

پہلا اصول

داعیٔ حق ازالۂ منکر اس وقت کرے جب اس کے پاس اس کی مناسب قدرت موجود ہو اور اس میں سب سے بڑی قدرت امیر کی ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہوتا ہے اور وہ امر و نہی پر قدرت رکھتا ہے اور وہ از روئے شریعت اس امر کا ذمے دار ہے کہ منکر کا ازالہ کرے الا یہ کہ گزشتہ بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اس منکر کے مٹانے میں ایسے مفاسد لازم آتے ہوں جو اس کے مصالح سے بڑھے ہوئے ہوں

اگر داعی منکر کے مٹانے پر قادر نہ ہو یا قدرت ہو لیکن اس سے کوئی بڑا فساد پیدا ہوتا یا اسے کوئی بڑا نقصان پہنچتا ہو، مثلاً یہی نقصان ہو کہ وہ اس کے بعد دعوتی کام جاری نہ رکھ سکے تو ایسی صورت میں وہ اس منکر کو صرف دل سے برا سمجھنے پر عمل کرے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اس اصول کے انطباق کی آپ یہ مثال دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کو باقی رکھا کیونکہ اس کے حامی موجود تھے، اگر آپؐ اسے

قتل فرما دیتے تو اس کی ساری جمعیت بھڑک جاتی اور آپؐ کے بارے میں یہ کہتی کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔[1]

دوسرا اصول :۔

منکر کو برا سمجھنا ہر حال میں ضروری ہے البتہ اس کے ازالہ کے لئے قدرت ضروری ہے۔ یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہونی چاہیئے کہ منکر کو ناپسند کرنا مکمل اور پورے طریقے پر ہو اس لئے کہ اصلاً مومن کو اسی شئے سے محبت ہو سکتی ہے جس سے محبت رضائے الٰہی کے مطابق ہو اور اس شئے سے نفرت ضروری ہے جو شئے رضائے الٰہی کے برخلاف ہو اور ان میں سے جس پہلو میں بھی ذرا سی خامی ہوگی وہ ایمان کی خامی پر نشاندھی کرے گی۔ اس لئے کہ دل سے منکر کو برا سمجھنا لازمی ہے، اگر یہ درجہ بھی موجود نہیں ہے تو ایسے شخص کا دل مردہ اور ایمان سے خالی ہے۔ کیونکہ آپؐ نے ایمان کے اس درجہ کو بیان کرکے کہ انسان دل میں منکر کو برا سمجھے، فرمایا کہ

' اس کے بعد ایمان کا کوئی رائی برابر بھی درجہ نہیں ہے '

غرض عملاً منکر کو مٹا دینے کے لئے قدرت اور استطاعت ضروری ہے، چنانچہ اللہ سبحانہٗ، کا فرمان ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

اللہ سے ڈرو جس قدر کہ اس سے ڈرنا چاہیئے

اگر مؤمن پوری طرح اپنے دل میں منکر کو برا سمجھتا ہو اور اس کو بدل دینے پر تیار ہو لیکن قدرت نہ ہونے کی وجہ سے عملاً اسے نہ بدل سکے تو اسے ثواب اس شخص کا سا ملے گا جو عملاً منکر کو مٹا دے۔

تیسرا اصول :۔

منکر کو مٹانے کے لئے بعض امور کی مدد حاصل کرنا درست ہے جیسا کہ تالیف

---

[1] : فتاوی ابن تیمیہؒ : ج ۲۸ ص ۱۲۱

قلب جائز ہے تاکہ مولفۃ القلب کے دل میں خیر کی جانب انسیت پیدا ہو جائے اور یہ تالیف مال دے کر بھی ہو سکتی ہے چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ

"میں انہیں دین کا جو کچھ حکم دیتا ہوں اس کے ساتھ دنیا بھی دیتا ہوں تاکہ ان کی طرف سے میرے سامنے کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے نمٹنے کی مجھ میں قدرت نہ ہو۔" [۱]

یعنی داعی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ منکر کے مرتکب کو اس کے چھوڑنے کا کوئی جائز صلہ دے دے مثلاً اگر کسی کا دوست جُوا کھیلتا ہو، اسے شاہسواری اور مسابقت وغیرہ پر انعام دیا جا سکتا ہے یا اگر کوئی شخص لہو و لعب کے مقامات پر جاتا ہو تو اسے جائز تفریح کے مقامات پر بھیجا جا سکتا ہے یا اگر کوئی رشوت لیتا ہو تو اس کی تنخواہ میں اضافہ کر کے اس کو اس سے روکا جا سکتا ہے۔

---

[۱]: عبداللہ بن الحکم: سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۶۰

تیسرا حصّہ

سیرت حسنہ کے ذریعے تبلیغ دین

سیرت حسنہ کی اہمیت

دعوت الی اللہ کا سب سے مفید مؤثر اور پرکشش ذریعہ خود داعیٔ حق کی شخصیت، اس کے افعال حمیدہ، اس کی سیرت عالیہ اور اس کے اخلاق حسنہ ہیں، اور اس کی ایسی عمدہ مثالی سیرت ہے جو لوگوں کے لئے نمونہ ہو اور ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہو جس سے لوگ اسلام کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں حقیقت یہ ہے کہ عمل کی تاثیر کلام کی تاثیر سے زیادہ گہری اور زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔

اسلام دنیا کے بہت سے ممالک میں مسلمانوں کی اخلاقی قوت اور ان کی بے مثال سیرت و کردار سے پھیلا ہے اور اس سیرت و کردار کی وجہ سے مسلمان غیر مسلموں کے لئے مثالی نمونہ بنے اور انہوں نے اس طرح اپنے عمل سے اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیا اور ان کی سیرت سے متاثر ہو کر سلیم الفطرت اور سلیم العقل لوگ اسلام لے آئے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہی کا اثر تھا کہ جب آپؐ نے حضرت خدیجہ رضؓ کے سامنے غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ

"آپ کو خوشخبری ہو، قسم بخدا اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا

اس لئے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں۔[1]

اسی طرح ایک روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ محمد بن عبداللہ، تو وہ بولا کیا آپؐ ہی کو عرب جھوٹا کہہ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں میرے بارے میں ان کا خیال یہی ہے، یہ سن کر وہ بولا۔ یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا، آپؐ کن امور کی جانب بلاتے ہیں؟ آپؐ نے اسے اسلام کے بنیادی اصولوں سے آگاہ فرمایا تو اعرابی نے کہا کہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً رسول اللہ۔

غرض اعرابی نے آپؐ کے چہرے اور آپؐ کی سیرت سے یہ سمجھ لیا کہ آپ صادق ہیں اور آپؐ کی دعوت سچی ہے۔

سیرت حسنہ کے اصول

سیرتِ حسنہ اور حسن کردار جس سے داعی کی شخصیت لوگوں کے لئے قابلِ تقلید مثالی نمونہ بنتی ہے اس کے دو بڑے اصول ہیں، ایک حسن اخلاق اور دوسرے قول و عمل کی مطابقت اور ہم آہنگی۔

یہ دونوں اصول اگر داعی کی زندگی میں رچ بس جائیں تو اس کی سیرت مثالی بن جاتی ہے اور اس کی زندگی لوگوں کے لئے عملی دعوت بن جاتی ہے۔ اور اگر اس کی سیرت میں ان دونوں اصولوں کا فقدان ہو تو اس کی سیرت اسلام سے نفرت دلانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس لئے داعی کو چاہیئے کہ وہ اللہ کا تقوی اختیار کرے اور لوگوں میں اپنی

---

[1]:- امتاع الاسماع، ص ۱۳، ۱۴

سیرت و کردار کے ذریعے مثالی نمونہ بن کر دعوت الی اللہ کے فرائض انجام دے۔

پہلا اصول

پہلا اصول حسن اخلاق ہے، اور داعیٔ حق کے اخلاق کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس مقام پر ہم صبر اور درگزر کو بیان کرتے ہیں، کیونکہ داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بردبار اور صابر ہو اور تکالیف کو برداشت کرنے والا ہو۔ حضرت علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اگر داعی میں صبر اور بردباری نہیں ہوگی تو اس کی دعوت بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ہو سکتی ہے چنانچہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ
ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان: ۱۷)

(نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے)

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں صبر کا حکم دیا اور فرمایا کہ

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: ۳۵)

(پس اے نبی صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے)۔

بلکہ درحقیقت صبر تبلیغ رسالت سے مربوط امر ہے اور داعی الی اللہ کے لئے صبر کی اہمیت بالکل واضح ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی ہی وحی میں صبر کا حکم دیا گیا اور فرمایا کہ

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ
فَاهْجُرْ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۱-۷)

(اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دُور رہو، اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لئے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو)

ان آیات کے آغاز میں اولاً مخلوق کو تنبیہ اور انذار کا حکم دیا گیا اور ان آیات کا اختتام صبر پر ہوا، چونکہ انذار خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اس لئے اس میں بھی صبر ضروری ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ داعیٔ حق کو درگزر سے جاہلوں سے اعراض کرنے سے اور اس راستے میں پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرنے سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور اس کی یہ صفات لوگوں کو قبول حق پر آمادہ کرنے والی بن جاتی ہیں۔

سیرت حسنہ کا دوسرا اصول

اچھی سیرت و کردار کا دوسرا اصول قول و عمل میں مطابقت ہے، اور داعی پر لازم ہے کہ وہ اپنے قول و عمل میں تضاد پیدا نہ ہونے دے کیونکہ نفس انسانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس کلام سے منتفع نہیں ہوتا جس کے ساتھ عمل نہ ہو، اسی لئے حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (ہود: ۸۸)

(اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں)

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہمیں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ ہمارے قول اور عمل میں کوئی تضاد ہو
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا

---

[1]: مجموع فتاوی ابن تیمیہؒ: ج ۲۸، ص ۱۳۶، ۱۳۷

عِنۡدَ اللّٰهِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (الصف : ۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں)

ان آیات کی روشنی میں داعئ حق کو اپنے نفس کو اس امر پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ اس کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو، اور اس کی سیرت میں قول و عمل کا تضاد نہ پایا جائے۔

اختتام

اللہ سبحانہٗ کے فضل و کرم سے میں اس قابل ہوا ہوں کہ اصول دعوت کے موضوع پر یہ کتاب تحریر کروں، اس میں جو بات حق اور صواب ہے وہ محض فضل الٰہی ہے اور جو بات غلط اور نا صواب ہے وہ میری لغزش و خطا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں، اس تصنیف سے میرا مقصود صرف اصلاح ہے

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔ (ہود : ۸۸)

میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

آخر میں حق سبحانہٗ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو اس کے لکھنے والے اور اس کے پڑھنے والے دونوں کے حق میں مفید بنائے اور انہیں اس آیت کا مصداق بنائے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (یونس : ۹، ۱۰)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا، نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی، وہاں

ان کی صدا یہ ہوگی کہ پاک ہے تو اے خدا، ان کی دعا یہ ہوگی کہ سلامتی ہو اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔

واللہ المستعان ولاحول ولاقوۃ الا باللہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحبہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین۔

مطبوعات شعبہ دعوۃ و ارشاد

ادارہ تحقیقات اسلامی ، پوسٹ بکس ۱۰۳۵

اسلام آباد ۔ پاکستان

* * * *

عظمت قرآن کریم

صلوات فاخرہ با حادیث متواترہ

کار دعوت کی دشواریاں اور مسائل

اسلام کی معاشی تعلیمات

حرمت سود

کسب حلال

- ※ The Meat : Lawful and unlawful in Islam
- ※ Why Islam forbids pork (Swine flesh) ?
- ※ Easy Method of Renouncing Bribary and importance of Earning Honest Livelihood
- ※ Sermons of the Holy Prophet MUHAMMAD (peace be upon him) (*under print*)
- ※ The Meaning & Significance of Dawat-ill-Allah (*Under Print*)

PRINTED AT THE
PRESS OF THE INSTITUTE OF ISLAMIC RESEARCH
ISLAMIC UNIVERSITY, ISLAMABAD